میراجی

میراجی

(ناول)

خان فضل الرحمٰن

مکتبہ میری لائبریری لاہور ۔ ۲

دیباچہ

ناول "میراجی"

ناول میراجی پر ایک محققانہ تبصرہ - از احمد جاوید جیلانی - مصنف تصویر شوبیز -

غالب نے خود کو شاہد باز کہا ہے۔ مگر انہوں نے اپنی شاہد بازی سات پردوں میں چھپا کر رکھی ہے۔ ایک ڈومنی سے مرزا کو ضرور لگاؤ تھا۔ ہم اُس کا نام نہیں جانتے۔ ہمیں اسکی معلومات خط کی ایک سطر سے ہوئی۔ مومن بھی اچھے خاصے عشق باز تھے۔ اُنکی محبوبہ کا نام بھی کہیں نہیں ملتا۔

قیس و فرہاد اور رانجھا بلکہ بندہ اور جنونی عاشق ہیں۔ شیلے نے ہیریٹ اور میری سے محبت کی۔ جان کیٹس فینی پہ فدا تھا۔ رابرٹ براؤننگ نے بیرٹ اغوا کی تھی۔

ان دل دادگان میں سے کسی نے بھی اپنی من ہرنی کا نام اختیار نہیں کیا۔ مگر محمد ثناء اللہ ڈار نے ایسا کیا۔ آج محمد ثناء اللہ ڈار کو محمد ثناء اللہ ڈار نہیں کہتے بلکہ میراجی عشق میں بقولِ شاعر نسب بھی ترک کرنا پڑتا ہے ؎

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیزے نیست

محمد ثناء اللہ کشمیریوں کے ڈار گوت سے تعلق رکھتا تھا۔ بنگالی لڑکی میراسین کو دل دے کر اُس نے اپنی کشمیری قومیت بھی چھوڑ دی تھی۔

خان فضل الرحمٰن کا یہ ناول تین حصوں میں بٹا ہے۔ لاہور۔ دہلی اور بمبئی۔ محمد ثناء اللہ ڈار ابھی اسکول کا طالب علم ہی تھا کہ وہ چوبُرجی یونیورسٹی گراؤنڈ لاہور گیا جہاں میچ ہو رہے تھے۔ ابھی کھیل شروع نہیں ہوا تھا کہ گھنگھور چڑھ آئے اور بوندا بوندی ہونے لگی، میچ القت کرنا پڑا۔ بہت سے تماشائی لیک روڈ سے اپنے ٹھکانوں کو لوٹ رہے تھے۔ انہیں میں ایک بنگالی ہرنی 'میراسین' بھی تھی، جس کا گھر لیک روڈ پر بنگالی بلڈنگ میں تھا۔ محمد ثناء اللہ ڈار کی اس لڑکی کے لئے وہی حالت تھی جو پاتری[1] کی پھول کی خاطر ہوئی ہے کہ پھول کھلے ہوئے دھوپ نکلی ہوئی ہے اور ایک پاتری پھول پر بیٹھ کر رس چوسنے کیلئے بے تابی میں اُڑتی پھر رہی ہے۔ بنگالی من ہرنی نے محمد ثناء اللہ ڈار کے دل میں اپنی محبت چبھو دی تھی اور وہ اِسی وقت سے اُس کے لئے سوچنے لگا تھا۔ اس کے دل میں میراسین سے ملامست کے خیال بھی آتے رہتے تھے۔ وہ اُس سے بات بھی کرنا چاہتا تھا کہ ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد
بسا ایں دولت از گفتار خیزد

ایک دن اُس نے "تھر آتے"[2] ہوئے میرا سے بس اِتنا کہا! "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے؟ وہ بلا جواب دئے ہوئے چلی گئی تھی اور یہ اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ

---

[1] پاتری : تتلی

[2] تھرانا : کانپنا

گیا تھا۔ اُس کی قسمت میں ملن کی جگہ نض برہا رہ گئی تھی۔" مگر وہ تو اپنا نام چھوڑ کر اب میرا جی بن گیا تھا۔ "جی" کے الفاظ اُس نے بنگالی جادو کی وقعت میں پڑھے تھے۔ وہ تو اس لڑکی کے لئے جوگی سا بنا پھرتا تھا۔ اُس نے گلے میں جینیو ڈال لی تھی۔

پہلے وہ آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازم ہو گیا تھا بعد میں آل انڈیا ریڈیو دہلی میں۔ وہ لاہور سے میرا سین کی محبت کا داغ لے کر گیا تھا۔ دہلی میں اس نے میرا سین کی جدائی کا غم غلط کرنے کے لئے کئی حسیناؤں سے ارتنگ برنگ ملانے کی کوشش کی ایک لڑکی عقمہ سے وہ ملامست کرتا کرتا رہ گیا تھا۔ دہلی کی آخری لڑکی کماری بادڈ سے جب اُسکی ملاقات ہوئی تو اُسکی بے وقت ہچکیوں کی ٹک ٹک نے اُس کی حقیری کر دی تھی۔ دہلی سے بمبئی روانہ ہونے سے قبل اُس نے لاہور کے ایک دوست کو خط لکھا تھا!

"میں اِس بھوساگر[1] میں کوئی نچھل[2] ادھر دھرماتما نہیں۔ بہت پاپی ہوں۔ لاہور میں میری اچھا تھی کہ میں میرا سین کو مالیوان[3] لے جا کر اُسے اپنا مرکب[4] بناتا رہوں۔ پر ایسا نہ ہو سکا۔ اس بنگالن کی سروس میں مجھ بارہ ماسئے[5] کو اتنے سال ہو چکے ہیں اور اُسکے لئے چتکاریاں[6] مارتے مارتے ان حالوں کو پہنچ گیا ہوں ؎

نامہ تلک گیا، نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گذر گیا

---

[1] بھوساگر : دنیا   [2] نچھل : معصوم
[3] مالیوان : ہندو دیومالا میں چاندی کے پہاڑ نیرو کے پاس سلسلۂ کوہ۔
[4] مرکب : جس پر سواری کی جائے۔
[5] بارہ ماسیہ : بارہ مہینہ کا نوکر۔
[6] چتکار : چیخ۔

میں دہلی پہنچ کر بھی نچھکا[1] نہ رہا۔ یہاں صفیہ معینی، سحاب قزلباش، مسز حمید حسین، عقمہ اور کرن مالا اہیرنی تھیں۔ انہوں نے اپنی گیدر سنگیوں سے مجھے اتنا متوالا کر ڈالا تھا کہ میری جو روز شیو کی عادت تھی، شیو نہ ہونے کے سبب میرے چہرہ پر جوئیں اور ڈھیرے سے نمودار ہو گئے تھے۔

مجھے اسکا آج تک افسوس ہے کہ جب میں بال بڑھوا سی اہیرنی سے ملنے گیا، تو میری وہ پورشنا کہاں چلی گئی تھی، جو پورشنا عقمہ پر اس طرح سے کھیل رہی تھی جس طرح سے سانپ ساون کی جھکی ہوئی گھٹاؤں کے وقت بجتی ہوئی بین پر کھیلا کرتا ہے ....

میرا سین نے مجھے کبھی نہیں دھتکارا۔ بال بڑھوانے تو مجھے بھینسکا ڈھوکھا[2] تک کہہ ڈالا تھا۔ میرا سین پوشپ[3] اور مدھوکر[4] پرس ہے اور گربی[5] نہیں۔ دہلی کی لڑکیاں تو مدمغ ہیں اور اہیرنی تو بچھی[6] ہے ....

میں میرا سین کا دلی باروماسیا بنا رہونگا میرے دل سے اُس کے لئے ہمیشہ یہ بول نکلتے رہیں گے ؎

سو بار بہم لگے
پھر بھی نہ جدا ہونگے

"میرا سین میری رادھا تھی، پر میں اُسکا شیام نہ بن سکا۔"

میراجی کا یہ خط تقریباً پورا نقل کر دیا گیا ہے جس سے ناول کے ہیرو کا پورا کردار سامنے آجاتا ہے، مثلاً اُسکی دل بستگی، اُسکا ہندی اور ہندو دیومالا سے نزدیکی تعلق، اور اُسکی جنسی بے راہ روی، بمبئی جا کر بھی میراجی ؎

---

[1] نچھکا: پاکباز
[2] ڈھوکھا: کھیت میں موذی جانوروں کے لئے پتلا
[3] پوشپ: پھول جیسا
[4] مدھوکر: رس بھرا میوہ۔
[5] گربی: مغرور۔
[6] بچھی: بچھو۔

می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دِگر

کے نرغہ میں رہا۔ لاہور میں وہ میرا سین کے شامی لگانے کی فکر میں تھا، اور دہلی میں کئی لڑکیوں سے اسی طرح سے بمبئی میں اُسے ایک پارسی لڑکی، رستمی مل گئی۔ میراجی مشہور افسانہ نگار کرشن چندر کی کوٹھی کی دوسری منزل پر ٹھیرا ہوا تھا، ادھر ہی رستمی بھی رہتی تھی۔ میراجی نے ایک لاہور سے آئے ہوئے چھینٹیا لڑکے مُشیر کی معرفت رستمی سے سلسلہ جنبانی کی ابتدا کی۔ اسکا باپ مالیوار[۱] کی پہاڑیوں میں بھیڑ بکریوں کا گلّا چرانے والا ایک گڈریا تھا۔ اِس کا رنگ اپنے باپ پر ملیا گیری[۲] تھا گو اسکی ماں پارسن تھی۔

غالب کا نامہ بر تو مکتوب الیہ سے ملنے کے بعد خود ہی غالب کے محبوب کا گرویدہ ہو گیا تھا جیسا کہ اس شعر سے ظاہر ہوتا ہے ؎

تجھ سے تو کچھ کلام نہیں لیکن اے ندیم
میرا سلام کہیو اگر نامہ بر ملے

پارسی لڑکی اور مشیر کے معاملہ میں اُلٹی بات ہوئی تھی یعنی میراجی کے نامہ بر نے رُستمی نے اپنا دل ہار دیا تھا۔ وہ اب ڈھابوں میں ناچنے گانے کی جگہ مُشیر کو شرابیں پلا پلا کر اور بھیرت[۳] دے دے کر اُس سے خوش طبعیاں کر رہی تھی۔ وہ ذرا دلیر کو بھی تنہا نہ چھوڑا جاتا تھا۔ میراجی کو اس آتش پرست محبوبہ کے چولھے کی آگ درکار تھی۔ تاکہ وہ اِس آگ کو پوج سکے۔

رستمی نے ایک چکادک کا جوڑا پالا ہوا تھا جس سے وہ بہت محبت کرتی تھی۔ مُشیر نے پنجرہ کی کھڑکی کھول کر یہ پرند اُڑا دیئے تو مالکہ سراسیمہ ہو کر اُن کے

---

[۱] مالیوار: مالابار
[۲] ملیاگیری: صندلی لکڑی جیسا رنگ۔
[۳] بھیرت: وہ سوپیہ جو چھنال عورت اپنے آشنا کو دے۔

پیچھے بھاگی اور قیدی لڑکے کو بھاگنے کا موقعہ میسر آگیا۔ اُس نے پارسن کے چولھے سے کچھ چنگاریاں تو اُٹھالی تھیں مگر وہ اِنہیں میراجی تک نہ پہنچا سکا۔ کیونکہ اس ہنگامہ میں وہ راہ بُرد ہوگئیں تھیں۔ یعنی میراجی بمبئی میں بھی اپنے رومان میں کامیاب نہ ہوسکا تھا۔

یہ کتاب میراجی کی ایک قسم کی سوانح عمری ہے۔ خان فضل الرحمان نے اِس ناول کو اس طرح سے ختم کیا ہے۔ "اقبال کو تو سمندر کی آبرو" ۔۔۔ سسلی کا ماتم بخشا گیا تھا، اور مجھ نااہل مصنّف کو اُردو کی آبرو محمد ثناء اللہ ڈار عرف میراجی کا ماتم بخشا گیا ہے۔

میر کا یہ شعر اس مجذوب سے اور مجتبیٰ مگر مفلوک و مفلوج اور بورا[1] سے انسان پر واقعی صادق آتا ہے ۔

پیدا کہاں ہوں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

دیکھنا یہ ہے کہ خان فضل الرحمٰن اپنی اس سعی میں کامیاب ہوئے یا نہیں۔ انھوں نے میراجی کی زندگی کے حالات معلوم کرنے کے لئے کافی جہد کی ہے۔ وہ میراجی کو لاہور کے سُرخ روشنیوں کے علاقہ میں لے گئے ہیں۔ اُسے ٹھرا بھی پلایا ہے۔ اُسے جنیو پہنے ہوئے ہندوانی پوجا کرتے ہوئے بھی دکھایا ہے مگر ہم یہ احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ دوست مارے گا بھی تو چھاؤں میں بٹھا کر۔

کتاب کی عبادت دل پذیر ہونے کے ساتھ آسان بھی ہے اگرچہ کئی مقامات پر ہندی کے مشکل الفاظ بھی استعمال کئے گئے ہیں۔ خود میراجی کی تحریروں پر بھی ہندی کی چھاپ موجود ہے۔ ناول میں بہت سے واقعات ایسے ملیں گے جن کا اصل سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ انکی بابت یہی کہا جاسکتا ہے کہ بڑھا بھی دیتے ہیں

---

[1] بورا ہا : پاگل سا۔

کچھ زیب داستان کے لئے اس کے لئے خان فضل الرحمان معافی کے مستحق ہیں، کیونکہ فکشن میں یہ روا ہے۔

احمد جاوید جیلانی (ایڈووکیٹ)
مصنف "تصویر شوہر"

لاہور اور میرا سیلن

یہ سخت جاڑوں کے دن تھے۔ مہاوٹیں برس رہی تھیں۔ اور دُھند کے سبب لاہور کا مطلع مکدّر تھا۔ کثرتِ باراں سے جَو اور گیہوں کے کھیتوں[1] میں کھوکھی لگ گئی تھی۔ لارنس گارڈن لاہور کے سبزہ زار پالے سے سفید بنے ہوئے تھے۔

لاہور میں کل رات آگ کی گنڈوں کے گرد لوہڑی کا تہوار منایا گیا تھا۔ گلی کوچے ایسے گیتوں سے گونج رہے تھے:۔

لوہڑی کا تہوار گیتو

لوہڑی کا تہوار

لاہور میں مزنگ اڈے کے پاس والے ہائی اسکول کے کچھ طلبا جن محمد ثنا اللہ ڈار بھی تھا، یونی ورسٹی گراؤنڈ میں ایف ۔ سی ۔ کالج لاہور اور سینٹ سٹیفن کالج ۔ دہلی کا ہاکی میچ دیکھ رہے تھے۔ تماشائیوں میں طالبات بھی تھیں انھیں پویلین میں جگہ ملی ہوئی تھی۔ شکر ہے کچھ دن سے بارش رکی ہوئی تھی۔

---

[1] کھوکھی: فصلِ ربیع کو نقصان پہونچانے والا کیڑا۔

اس لئے کھیل کا میدان کھیل کے قابل تھا۔ ابھی میچ شروع ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ پچھم دشا سے کالے ڈراؤنے بادل گھنگھور چڑھ آئے تھے۔ ایسے ہی گھنگھور ثنا اللہ نے دیکھے تھے۔ جب وہ زمانۂ طفلی میں کاٹھیاواڑ کی اُس پہاڑی پر چڑھ رہا تھا، جو کالی کے مندر کی جائے وقوع تھی۔

سری کرشن کو دوارکا ناتھ بھی کہتے ہیں۔ کیونکہ دوارکا کاٹھیاواڑ میں اُن کے رجواڑ کی راجدھانی تھی۔

ہندوتمدّن میں اندھیرے ڈراؤنے جنگلوں کا بھی ذکر ملتا ہے۔ جن میں شیر، چیتوں جیسے درندوں کے کچھار ہوتے ہیں، کمیڈھیئے[1] اور بھاری بھرکم گج[2] پھرتے ہوتے، یہیں ایسے پُرجوش دریا بہتے ہیں کہ جنکا جوش جھکی ہوئی سیاہ ریچھنی جیسی گھٹاؤں کے بے انتہا پانیوں سے اتنا بڑھتا رہتا ہے کہ یہ دریا اپنے کنارے پھلانگ کر چیدہ درختوں کی دھرتی کو شرابور کرتے رہتے ہیں۔ تو جب اُس دن گھنگھوروں سے بوندا باندی تک ہونے لگی، تو پنجاب یونیورسٹی گراؤنڈ میں میچ القت کرنا پڑا۔ کھلاڑی اور تماشائی یونیورسٹی گراؤنڈ سے واپس آرہے تھے، انہی میں محمد ثناء اللہ ڈار بھی تھا۔

محمد ثنا اللہ ڈار اور اُسکے ساتھیوں کے ساتھ ساتھ ایک حُسنِ بنگالہ لڑکی بھی آرہی تھی۔ اُسکا رنگ کھلواں گورا تھا۔ حالانکہ بنگالی عام طور سے گھنگھوروں سانولے ہوتے ہیں، اِس لوہت آہن[3] اسپرا[4] کی آنکھیں کجری کجری تھیں۔ وہ گاڈیرداری ایسی تھی، اور بے حد چھلانگن سجا تھی۔ شاید اُس نے

ع۱ کمیڈیا: چھوٹی نسل کا ہاتھی۔
ع۲ گج: پورا ہاتھی۔
ع۳ لوہت آہن: سُرخ چہرہ۔
ع۴ اسپرا: پری۔

دوڑدل اور ہاکی جمیوں میں تمغے حاصل کئے ہوں ــــ لیکن اس میں لچیلا پن[1] بھی تھا اور طربناک بھی تھی۔ اُس کے ہونٹ سُورس[2] تھے۔ اُس نے ناگیسری[3] ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔

محمد ثناءاللہ ڈار نے اِس حُسنِ بنگالہ کو یونیورسٹی گراؤنڈ میں دیکھا تھا۔ پھر یہ لڑکیوں کے مجمع میں غائب ہو گئی تھی۔ لیکن ثناءاللہ ڈار تو اُس سے میل[4] میلاں[5] کے لئے لہلوٹ[6] ہو گیا تھا۔ محمد ثناءاللہ ڈار اور اُسکے ساتھی ابھی بنگالی بلڈنگ ہی تک پہنچے تھے، جو جین مندر کے تقریباً مشرق میں تھی، جین مندر سڑک پار مغرب میں تھا۔ کہ بڑے زور کا ڈونگڑا آ گیا۔ محمد ثناءاللہ ڈار اور اسکے ساتھیوں نے بنگالی بلڈنگ کے کھلے برآمدہ میں، جو سڑک کی طرف تھا، پناہ حاصل کی ــــ یہ کافی کرسی دار تھا۔

اس برآمدہ میں دو کھڑکیوں کے درمیان گھر کا دروازہ تھا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند تھیں۔ محمد ثناءاللہ ڈار اپنی پیٹھ دروازہ کی جانب کئے کھڑا تھا، کہ جبھی وہاں وہی گاڈ پرداری چھلانگن سی اور لچیلی بنگالن آ گئی۔ اُس کا جسم پیتامبری ساڑھی میں ملبوس ہونے کے باوجود اس لئے برہنہ تھا کہ ساڑی اُس کی سڈولتا

---

[1] لچیلا پن: Flexibility ۔ نرمی ۔ ملائمت ۔

[2] سُورس: رس سے بھرپور۔

[3] ناگیسری: ناگیسر کے پھول کے ہم رنگ، ہلکا زرد۔

[4] میل: خواہش

[5] میلاں: رغبت

[6] لہلوٹ: بے تاب

چھپانے میں قطعی عاری تھی، کیونکہ وہ ناہد[1] تھی۔ لیکن اس کے سینہ کا ابھار اور
لچکتی ہوئی سی سرین کمر زبانِ حال سے کہہ رہے تھے کہ اُس کا مفرّح[2] کتابی چہرہ اور
متعذّب[3] ہونٹھ تو جو ہیں سو ہیں، لیکن ہم بھی بہت کچھ ہیں۔ اُسکی فربہ سانتھلوں،
متکاسف[4] رانوں اور گول گول پنڈلیوں سے بھی گویا یہی آواز نکل رہی تھی ——

لڑکی سیدھی دروازہ پر آئی۔ تاکہ دستک دے کر کواڑ کھلوائے جا سکیں،
لیکن وہاں تو محمد ثناء اللہ ڈار پیٹھ کئے ہوئے کھڑا تھا۔ لڑکی سمجھتی تھی کہ محمد ثناء اللہ
اسے دیکھتے ہی جھینپ کر دے گا۔ لیکن محمد ثناء اللہ تو تو آنے والی کی چیک مٹک اتنی
مبہوت کر چکی تھی کہ وہ رکے ہوئے دروازہ سے ذرا بھی نہ ہلا۔ یوں تھوڑی دیر
کو بنگالن اور اس کشمیری لڑکے کی آنکھیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں۔ یہ دونوں
اتنے مُتصل تھے کہ درمیانی فاصلہ بمشکل ایک گز ہوگا۔

یہ عجیب ماجرا دیکھ کر محمد ثناء اللہ ڈار کے ساتھی لڑکی کی مدد کو آگئے۔ اُنھوں
نے مزاحم کو دروازہ سے ہٹا دیا۔ اب لڑکی دستک دے رہی تھی۔ اور محمد
ثناء اللہ ڈار بے مقدور ماؤف کھڑا ہوا دعا مانگ رہا تھا کہ کواڑ کبھی نہ کھلیں
کواڑ تو کھُلنے اور بند ہونے کے لئے ہی ہوتے ہیں۔ یہ کھلے اور بند ہو گئے۔ لڑکی
اندر چلی گئی۔ محمد ثناء اللہ ڈار کا یہ حال ہو گیا تھا کہ جیسے بہادر شاہ ظفر کے ہاتھ سے
دلّی نکل گئی ہو۔ حالانکہ دلّی اُسکے ہاتھ میں تھی کہاں جو نکلتی ——

محمد ثناء اللہ ڈار کے دل میں اِس بنگالی لڑکی کے لئے بے حد مراغبت
پیدا ہو گئی تھی۔ آئندہ وہ اُسے کجرے کجرے نینوں والی گوری کہا کرتا تھا۔ دروازہ

---

[1] ناہد: وہ لڑکی جس کی چھاتیاں ابھی ابھی اُبھری ہوں۔
[2] متفرح: فرحت بخش۔
[3] متعذب: ذائقہ دار۔
[4] متکاسف: موٹا۔

پر درگا پرشاد سین ملٹری اکاؤنٹنٹ کی تختی لگی ہوئی تھی۔
پانی رُک گیا، تو محمد ثناءاللہ ڈار اور اُسکے ساتھی گھروں کو روانہ ہو گئے
محمد ثناءاللہ ڈار دل ہی دل میں "سین سین" پکارتا جا رہا تھا۔ کیونکہ اُس کے خیال میں بھرے بھرے نینوں والی گوری دُرگا پرشاد سین کی ہی دختر ہو سکتی تھی۔ نیز اُسکے نام کا آخری لفظ سین ہی ہو سکتا تھا۔
مگر وہ تو اُسکی آنکھوں سے ایسی اوجھل ہو گئی تھی جس طرح سے جین مندر کا لمبوترے گنبد کا کلس گھنگھور میں معدوم ہو گیا تھا۔ اسکی سمجھ کہہ رہی تھی۔ کہ گھنگھور آخر چھنٹے گا، دھوپ نکلے گی، اور جین مندر کے لمبوترے گنبد والا کلس سورج کی کرنوں میں چمکے گا۔

۳

محمد ثناءاللہ ڈار کا گھر مزنگ۔ لاہور کے کوچۂ سردار شاہ میں تھا۔ اُس کے آباؤ اجداد جنت کشمیر سے بعد از زمانۂ شاہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر پنجاب میں وارد ہوئے تھے۔ لاہور سے پہلے اس خاندان کی رہائش ایمن آباد ضلع گوجرانوالہ میں تھی۔ ثناءاللہ کا باپ ریلوے انجینیئر تھا، جس کی بدلیاں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی سلسلہ میں محمد ثناءاللہ ڈار نے کاٹھیاواڑ، لوستان (بلوچستان)، سانگھڑ اور جیکب آباد دیکھے تھے۔ اُسے موسیقی سے دلچسپی تھی۔ اور خود بھی اچھا گا لیا کرتا تھا۔ سانگھڑ اسکول کے ایک ڈرامہ میں اُس نے ایسے کرتب دکھائے تھے کہ اُسے انعام ملا تھا۔ شاعری میں بھی اس نے طبع آزمائی شروع کر دی تھی اور ساسری تخلص اختیار کیا تھا۔ جیکب آباد سے اُس نے لاہور بھاگ آنے کی کوشش بھی کی تھی۔

محمد ثناء اللہ ڈار بنگال بلڈنگ سے لوٹا، تو گھر والے دوپہر کا کھانا کھا
چکے تھے۔ ماں نے ثناء اللہ کے لیے بھی دسترخوان بچھایا، لیکن اس کے بیٹے
کی تو بھوک بھاگی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ یوں ہی سے لقمے اٹھائے اور بس۔ ماں
اُسے دولانے[1] لگی کہ آخر اُسے کیا ہوگیا، مگر اُس نے تو چُپ سادھی ہوئی تھی۔
وہ کھانا اُکڑوں بیٹھ کر کھایا کرتا تھا۔ اُس کے بیٹھنے پر اعتراض کرتے تو وہ کہا
کرتا تھا کہ اگر اُکڑوں بیٹھ کر نہ کھائیں، تو کھانا دسترخوان پر بیٹھنے والے پر حملہ
کرتا ہوا دکھائی دیا کرتا ہے، اور اگر اُکڑوں بیٹھ کر کھائیں، تو گویا کھانے والا
کھانے پر حملہ کر رہا ہے۔

پھر وہ اپنے کمرہ میں چلا گیا۔ اُسے اب تک جلد سونے کی عادت تھی
لیکن آج وہ آدھی رات کے بعد تک جاگتا رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں کڑوا رہی
تھیں، لیکن نیند کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے دیوار بھی اور
دہی بنگالی بلڈنگ والی لڑکی نکلی۔ اُسکی تمام رات ہی تقلقل[2] و تقلیب[3] میں گزری
تھی۔

اگلے دن محمد ثناء اللہ ڈار گھر سے تو اسکول کے لئے چلا، لیکن اُس نے
بجائے اسکول لارنس گارڈن کی راہ لی تھی۔ بہت اتنا پڑ رہا تھا کہ پرند اپنے
گھونسلوں اور کھوکھرن میں چھپے بیٹھے تھے۔ تانگوں کے گھوڑوں پر دبیز کموں

---

[1] دولانا: جھنجھلانا۔
[2] تقلقل: بے قراری۔
[3] تقلیب: کروٹیں بدلنا۔

کملوں کی جھولیں پڑی ہوئی تھیں، لیکن گھوڑے پھر بھی کانپ رہے تھے۔ بُوندا باندی تو نہیں ہو رہی تھی مگر عُوجنا ہو رہا تھا۔ جسموں کو کاٹنے والی سیٹ بھری برفانی ہوا چل رہی تھی۔ کہتے تھے کہ شملہ، ڈلہوزی اور مری میں اتنی برف باری ہوئی ہے کہ سڑکیں برف سے اٹ گئیں، اور جو دروازے کھڑکیاں باہر کی طرف کھلتی تھیں، اُن کا فی الحال کھلنا ناممکن ہو گیا تھا۔ کیونکہ برف اُن کے کافی اُوپر تک چڑھی ہوئی تھی۔ سُن رہے تھے کہ پہاڑوں میں دریائے سندھ کا پانی برف بن گیا ہے۔

محمد ثناءاللہ ڈار کبھی منٹگمری ہال کے سامنے جاکر کھڑا ہو رہا تھا، کبھی باغ کے اُس حصّہ میں جاکر، جس کی جائے وقوع چڑیا گھر کے ساتھ ملحق تھی، وہ داڑھی والے برگد پر لٹکتی ہوئی چمگادڑوں کی چیخ دیکار سنتا رہا تھا۔ کبھی وہ بید مجنوں تلے آکر یہ سوچنے لگتا کہ جب اس درخت کا نام مجنوں کی نسبت سے رکھا گیا تھا، تو اس کے نام کا بھی تو کوئی درخت ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ بھی اسی قبیل سے ہے جس قبیل سے قیس نجدی تھا۔ بید مجنوں کے سامنے باغ کی شمالی پہاڑی تھی۔ محمد ثناءاللہ ڈار اس پہاڑی پر چڑھتے ہی مغرب کی طرف نظر دوڑانے لگا تھا۔ جدھر بنگالی بلڈنگ تھی۔ بھلا کہاں یہ پہاڑی کہاں یونیورسٹی گراؤنڈ کے پاس بنگالی بلڈنگ۔ یہ تو ایسا تھا کہ جیسے گھور گھٹائیں چڑھی ہوئی تھیں، اور کوئی عید کا چاند دیکھنے لگے۔ بنگالی بلڈنگ اور لارنس گارڈن میں کافی فاصلہ ہونے کے علاوہ درمیان میں بہت سی اُونچی اونچی عمارتوں کا جنگل سا بھی تھا۔

اب محمد ثناءاللہ ڈار کو اسکول بھیجتے تو وہ لارنس گارڈن پہونچ جاتا، یا اُسکی منزل بنگالی بلڈنگ ہوتی۔ کبھی وہ بجلی کے کھمبے کے پاس، اور کبھی سڑک پار کھڑا ہو کر انتظار کرتا اور دیکھتا رہتا تھا کہ کب وہ بنگالن گھر سے نکل کر نیلے گنبد کے پاس ایف سی کالج جاتی ہے، جہاں اس نے داخلہ لیا ہوا تھا۔ پھر اس کی نظریں کالج کے جنوبی پھاٹک پر لگی رہتیں تاکہ وہ اس لڑکی کو کلاسیں ختم کرنے کے

بعد گھر لوٹتا ہوا دیکھ سکے۔ اُسے فی الحال رفث[1] و رفث[2] کی نہیں بلکہ اسکا نام معلوم کرنے کی تمنا تھی۔

بنگالی بلڈنگ کی طرف ہی ایک نائی کی دوکان تھی، جس سے ثناء اللہ نے یارانہ گانٹھا ہوا تھا تاکہ اسی طرح بنگالی پری سے کچھ قرب حاصل ہو سکے۔ اُس نے اِس نائی کا نام "نشیچے" رکھا ہوا تھا جس کے معنی امانت ہیں۔

۵

پھر ایک رات ہولی سے کچھ دن پہلے ایف۔ سی۔ کالج۔ لاہور میں بنگالی موسیقی کا جشن منایا جا رہا تھا۔ ثناء اللہ کو اس کی خبر لگ گئی تھی۔ اُس نے بنگالیوں کی طرح سر ننگا کیا، ماتھے پر رولی لگائی، اور قنات عبور کر کے شامیانے میں پہنچ گیا۔ اُسے اُمید تھی کہ مس سین تقریب میں ضرور حصّہ لیگی۔ اور یہاں وہ اُسے خوب دیکھ سکے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کا نام بھی آج معلوم ہو جائے۔

شامیانے کو برقی قمقموں سے سجایا ہوا تھا۔ ڈائیس کے لیے دو تخت جوڑ کر بچھائے ہوئے تھے۔ جن پر تیز نیلی قالین کا فرش تھا۔

محفل رات کے دس بجے گرم ہوئی اور ٹیگور کے گیت گائے جانے لگے۔ بہت سی لڑکیوں کو باری باری سے پکارا گیا، اور گا ناچ کر چلی گئیں۔ اِن میں وہ نہیں تھی۔ جس کا ثناء اللہ شائق تھا۔

اُس وقت آدھی رات گذر رہی تھی۔ جب میرسین کا نام پکارا گیا، اور بنگالی بلڈنگ کی جادو گرنی ڈائیس پر آئی۔ اب ثناء اللہ کو معلوم ہو گیا کہ

---

[1] رث: عورت سے بھوسہ بازی۔

[2] رفث: جماع میں عورت سے بات چیت۔

اس غلالوں[1]، قوسین[2] ہائے مشکیں اور رہبت آسن والی کا نام کیا ہے۔ تیز دہ بارش سے پناہ لینے کے لیے اسی فسوں ساز کے دروازہ پہ کمر لگائے کھڑا ہوا تھا۔ اسکی طبیعت چاہ رہی تھی کہ ثیب[3] و شیب میں آکر اُس کے نام کے زور زور سے نعرے لگائے۔

میرا سین نے فقید المثال فکاہت[4] کے ساتھ ٹیگور کا ؎

"مسخے آشے آشے"

والا بنگالی زبان کا گیت گایا تھا۔ اس گیت کے بول محبوب کی آمد آمد کے متعلق تھے۔ ثناء اللہ اس گیت کے معنی نہیں جانتا تھا۔

میرا سین نے ایک اردو غزل بھی گائی تھی، جس کے دو شعر ہیں:۔

ہو گذر گلشن میں گر اُس غیرتِ شمشاد کا
غنچے چٹخیں باغ میں غل ہو مبارک باد کا

اے بتو اس آہِ سوزاں سے میری ڈرتے ہو
ہے خدا کا قہر ہر شعلہ میری فریاد کا

غزل کسی غیر مشہور شاعرہ کی، لیکن صاحبۂ دیوان بہ تخلص "شرم" کی تھی۔ ثناء اللہ نے شرم کا دیوان کتب فروشوں اور پنجاب پبلک لائبریری میں تلاش کیا مگر دستیابی نہ ہوئی۔

جشن ختم ہوا تو میرا سین ہمجولیوں میں غائب ہو گئی۔ اور ثناء اللہ اُسے ڈھونڈتا ہی رہ گیا تھا۔ مجبور ہو کر اُس نے بنگالی بلڈنگ کی دوڑ لگائی، اور

---

[1] غلالہ = زلفِ معشوق

[2] قوسین = معشوق

[3] ثیب و شیب : مدہوش کی بھوئیں۔

[4] فکاہت : خوش طبعی

کرسی دار برآمدہ میں آکر کوار ٹو ہے، وہاں اندر سے کنڈی لگی ہوئی تھی۔

اب وہ سڑک پر کھڑا ہوا بنگالی بلڈنگ کو دیکھتا رہا، اور رنگا رنگ ساڑھیوں والی کا سوار کار[1] بننے کے لئے لیکن جب کچھ راہ گیر اُسکی طرف متوجہ ہوئے تو پہلے تو وہ "نشیچے" نائی کی دکان پر پہنچا اور پھر اس نے مزنگ روڈ سے ہوتے ہوئے لارنس گارڈن کی راہ لی۔ اُسے تمام راستہ میرا بین پر سوار سوار کاری[2] کے خیال آتے رہے تھے۔ وہ افلاطونی پاک محبّت کا قائل نہیں تھا۔

کچھ دیر بیدِ مجنوں تلے کھڑے ہوکر وہ باغ کی جنوبی پہاڑی پر چڑھ گیا۔ اور پچھم کی طرف نگاہیں دوڑانا شروع کر دیں۔ جدھر بنگالی بلڈنگ تھی۔ جب اُس نے ٹیگور کے اُس گیت کے بول سنے تھے ؎

"مسخے آشے آشے"

وہ لگاتار بنگالی کے یہی بول گنگناتا رہا تھا۔ باغ میں داخل ہوتے ہوئے اُس کے لبوں پر یہ شعر بھی تھے۔

؎ ہو گزر گلشن میں گر اُس غیرتِ شمشاد کا
غنچے چٹکیں باغ میں غل ہو مبارک باد کا

اے بُتو اِس آہِ سوزاں سے میری ڈرتے رہو
ہے خدا کا قہر ہر شعلہ میری فریاد کا

مگر وہ اِس تمام عرصہ میرا بین پر سوار کاری ہی کے ضمن سوچتا رہا تھا۔ اُس کے دماغ میں اس لڑکی کی مہندوانی سُگندھیں[3] بسی ہوئی تھیں، اور

---

[1] سوار کار: چابک سوار۔

[2] سوار کار: چابک سواری۔

[3] سگندھیں: خوشبوئیں۔

میرا سین کی سوکھتی ہوئی ساڑھیوں کے رنگ۔ وہ اِن ساڑھیوں کے اندر والے سریر کی ذائقہ دار نہفتیوں اور دلدار کولھوں کو ٹھونگنا چاہتا تھا۔

۶

اب ثناءاللہ نے اپنی گت یہ بنائی ہوئی تھی کہ گلے میں جنیو، ماتھے رولی گویا اس نے بت کافر کے لئے اسلام ترک کر دیا تھا۔ بجائے تہلیل و اذان و قرآن کے اُسے شِوالوں کے گھنٹوں، سنکھ اور بھجن سُننے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ وہ تو صبح صبح سورج پوجا تک کرنے لگا تھا۔ میرا سین اُسے سجدہ کو کہتی، تو وہ اُسکے آگے سربسجود ہو جاتا۔ اُس نے ہندو فقیروں جیسے کپڑے پہننے شروع کر دئے تھے۔

وہ یہ مصرعہ گنگناتا پھرنے لگا تھا ؎

جوگی کا برن ہم نے لیا یار کی خاطر، دلدار کی خاطر

اب اس نے اپنا اسلامی نام محمد ثناءاللہ اور سامری تخلص چھوڑ کر میرا جی کا نام اور یہی تخلص اختیار کر لیا تھا۔ سابق ثناءاللہ سامری اور حال میرا جی میٹرک کے امتحان میں بیٹھا، لیکن اُس کی تیاری نہ تھی۔ کیونکہ اُس نے تو تمام وقت بنگالی بلڈنگ، ایف۔ سی کالج، لارنس گارڈن اور اسکی پہاڑیوں پہ آتے جاتے گذار دیا تھا۔ وہ امتحان کے ہال میں تھوڑی دیر بیٹھ کر باہر آگیا۔ اُس نے اپنی کاپی صرف میرا سین کا گھسیٹواں نام لکھکر پھاڑ دی تھی۔ اب تک ثناءاللہ ڈار عُرف میرا جی، اِس حُسنِ بنگالہ کو صرف دُور دُور سے دیکھ سکا تھا، دولت گفتار کی نوبت نہیں آئی تھی۔ میرا سین کے ساتھ ملامست کا خیال بھی اُسکے دل میں آتا رہتا تھا۔

ایک دن ثناءاللہ ایف۔ سی۔ کالج کا عذ کے ایک سفید پُرزہ پر میرا سین کا

نام انگریزی میں لکھ کر بھیجا، اور جس وقت وہ کالج سے باہر آرہی تھی، تو اُس نے دیکھا کہ ایک زنانہ پوش قشقعہ بر جبیں بھولہ سالڑکا کاغذ کا ایک پرزہ مُبایعت[1] کے ساتھ اُسے پیش کر رہا ہے۔ اُس نے یہ پرزہ لیا، دیکھا، اور زمین پر پھینکتے ہوئے بڑھی چلی گئی۔ ثناء اللہ اس سے کوئی بات نہ کر سکا تھا۔

دوسری مرتبہ میرا سین اور ثناء اللہ کا آمنا سامنا بنگالی بلڈنگ کے پاس ہوا، اور اُس نے بنگالن سے بات کرنا چاہی، لیکن بات نہ کر سکا۔ وہ تو عبوست[2] لیکن خم و چم[3] دکھاتے ہوئے، نہایت عُجلت کے ساتھ دامن ساجھٹک کر اپنے گھر چلی گئی تھی اور ثناء اللہ قرکس[4] اور پنجج[5] سا کھڑا رہ گیا تھا۔

تیسری مرتبہ اُس نے بھراتے[6] ہوئے اتنی بہادری دکھائی کہ اس نے میرا سے صرف اتنا کہا "مجھے آپ سے کچھ کہنا ہے"۔ وہ بلاجواب دیے ہوئے چلی گئی۔ اور یہ اُسے دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا تھا۔ اُسکی قسمت میں ملن کی جگہ محض برہا رہ گئی تھی۔

ثناء اللہ بوہنی[7] سے رونگن[8] تک جنسی تعلقات کا دھنی تھا۔ افلاطونی محبت واقعی اُس کے لئے جوازیت نہیں تھی۔ اسی لئے تو وہ دو مرتبہ آتشک جیسی

---

۱ مبایعت : تابع داری۔

۲ عبوست : بدخلقی

۳ خم و چم : ناز و نخرہ

۴ قرکس : بے وقوف

۵ پنجج : پژمُردہ

۶ بھرانا : کانپنا

۷ بوہنی : پہلی بکری

۸ رُونگن : گاہک کو خرید کر جاتے وقت کچھ دینا۔

نامرادی جیاری میں بھی گرفتار رہا تھا۔ مگر اُسے جنجالی نہیں کہہ سکتے تھے۔ جس سے اُسے محبت ہوتی، اور وہ اُس پر دسترس حاصل نہ کر سکتا، تو وہ جھلاتا نہیں، بلکہ بقول حسرت موہانی اُس کی یہ کیفیت ہوتی تھی ؎

دیکھنا بھی جو اُنہیں دُور سے دیکھا کرنا
شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

۷

میرا سین میں اس کے لئے خاص دلچسپی اس لئے بھی تھی کہ اس کے دل میں ہندو دیومالا، دیوداسیوں، لنگ پوجا[1]، یونی پوجا[2] اور خاص طور پر مدھوبن کی گوپیوں، سری کرشن، رادھا کے بہلاوُں کے نقشے بھی رہتے تھے۔

چوتھی مرتبہ میرا سین ایف۔ سی کالج سے نکل کر نیلے گنبد کے پاس سے گذر رہی تھی کہ اُس کے گلے سے مونگوں کا ہار ٹوٹ کر مونگے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ اُس نے ثناءاللہ کو بھی دیکھ لیا تھا۔ وہ ہار کے مونگے بکھرے ہوئے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ثناءاللہ نے تمام مونگے چن لئے تھے۔ چونکہ مونگوں کا سرخ سرخ تھا، اس لئے اِنھیں چننے میں کوئی دقت پیش نہ آئی تھی۔ اُس نے یہ مونگے پٹوے سے بلوائے اور جنیو کے کالے کالے دانوں کے ساتھ ان لال لال مونگوں کی مالا بھی پہن لی۔

اس واقعہ کے بعد میرا سین کالج بائیسکل پر آنے لگی، تو ثناءاللہ ایک

---

[1] لنگ پوجا: مرد کے حصۂ تناسل کا پوجنا۔

[2] یونی پوجا: عورت کے حصۂ تناسل پوجنا۔

دن سائیکل اسٹینڈ پر پہنچا، اور اس نے فکاہت[1] کے طور پر بائیسکل کے ٹیوب سے ہوا نکال دی۔ میرا سین نے دکان سے ہوا بھروانا گوارا نہ کیا۔ وہ گھر پیدل جا رہی تھی اور ثناء اللہ اپنی بے شعوری پر ہاتھ ملتا رہا تھا۔

پھر ثناء اللہ آنکھ بچا بچا کر سائیکل اسٹینڈ پر پہنچنے لگا تاکہ سائیکل کا ہینڈل چوم سکے کیونکہ میرا سین اُس پر ہاتھ رکھتی تھی۔

ثناء اللہ کو یہ عمل کرتے ہوئے سات تو خیریت سے گذر گئے، مگر آٹھویں دن یہ ہوا کہ سات دن چور کے آٹھواں دن سادھ کا۔ میرا سین کے ایک حمائتی، ڈی۔ این۔ کُلہن نے یہ چوری پکڑ لی۔ یہ بھی میرسین پر مرتا تھا، جس نے آتے ہی "رقیب" پر لطمات کی بارش کر دی۔ اس کینہ توز کو میرا سین کی تو کیا، اُسکی بائیسکل کے ہینڈل تک ماچا ماچی ناگوار گزری تھی۔ ثناء اللہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ گیا تھا۔

اس کے بعد ثناء اللہ سے بائیسکل کے ہینڈل کی ماچا موچی تو نہ ہو سکی، لیکن وہ انڈیا ہاؤس واقعہ مال روڈ لاہور کھڑا ہونے لگا تاکہ وہاں سے میرا سین کو مال روڈ عبور کرتے ہوئے دیکھ سکے۔ انڈیا ہاؤس کے پاس کھڑے ہوئے وہ میرا سین کی بائیسکل کی ماچا ماچی تو کیا، وہ تو خود میرا سین کے لب و رخسار کی ہوائی ماچا ماچی کیا کرتا تھا۔ یہاں اُسے دید بازی کے اچھے موقعے ملتے تھے۔ کیونکہ ٹریفک کی کثرت کے سبب گذرگاہ کچھ دیر بند رہتی تھی۔ اور جب تک ٹریفک کا سپاہی اشارہ نہ دے دیتا بنگالن کو ٹھہرا رہنا پڑتا تھا۔ مگر یہ ہوائی ماچا ماچی اور دید بازی اس طرح ہوتی تھی کہ کوئی اسکے استغراق کو نہ دیکھ سکے۔

ایک مرتبہ اس نے میرا سین کے باپ درگا پرشاد سین کو دروازہ پر بُلانے

[1] فکاہت: خوش طبعی۔

کی گھنٹی بجائی مگر جوں ہی میراسین نے کواڑ کھولے، وہ فرار ہو گیا۔ اور یونہی جب سرِ راہ اُس نے اس بنگالن سے ہم کلام ہونے کی کوشش کی تو میراسین نے اُسکے منہ پر تھپڑ سا مارتے ہوئے پوچھا۔ "Who are you ؟"
"تُو کون ہے ؟" تو اِسے بھاگتے ہی بن پڑی تھی۔

یونہی کئی سال گزر گئے۔ ثناء اللہ تین مرتبہ میٹرک کے امتحان میں بیٹھا مگر کامیابی نہیں ہوئی کیونکہ اُس کے ہر دلے میں تو ہر وقت میراسین کا خیال رہتا تھا۔ اُسکی طبیعت پڑھائی سے اُکتائی اُکتائی رہتی تھی۔ اُسکے کس و کو نے اُسے ہومیو پیتھی کا ڈاکٹر بنانا چاہا۔ لیکن چند روز پڑھ کر اُس نے وہاں سے بھی راہ فرار اختیار کی۔ اب اُسکی مزید تعلیم سے سب گھر والے مایوس ہو گئے تھے۔

اُدھر میراسین نے ایم۔ اے "انگریزی" امتیاز کے ساتھ پاس کر لیا تھا" اور اُسے لکھنؤ یونیورسٹی میں جونیئر لیکچرر کی جگہ بھی مل گئی تھی۔ اس کا خاندان بھی لکھنؤ منتقل ہو گیا تھا۔ ثناء اللہ نے میراسین کی نقل و حرکت معلوم کرنے کی کوشش گو معلوم نہ کر سکا۔ حالانکہ اُس نے میراسین کے باپ، ڈرگا پرشاد سین، کے چاکروں سے رابطے قائم کئے ہوئے تھے تاکہ میراسین کے معمولی سے معمولی واقعات تک اُسے معلوم کر سکیں۔

ثناء اللہ کے اب بھی بنگالی بلڈنگ، ایف۔ سی۔ کالج، نیلہ گنبد کے اس مقام پر، جہاں میراسین کا مونگوں والا ہار ٹوٹا تھا، اور لارنس گارڈن کے چکر پہ چکر لگ رہے۔ باغ کی شمالی اور جنوبی پہاڑیوں پر چڑھ کر وہ اب بھی مغرب میں بنگالی بلڈنگ کو دیکھنا چاہا کرتا تھا۔ اسے تو میراسے کبھی میر کی طرح یہ بات تک نصیب نہیں ہوئی تھی ؎

وہ کج روش جو ملا راہ میں کبھی مجھ سے
عجیب طرح سے اُس نے میرا سلام لیا

اب اس نے غمِ عشق سے پناہ لینے کے لئے زیادہ ہی شاعری شروع کر دی تھی۔ وہ اکثر پنجاب پبلک لائبریری میں دیکھا جانے لگا تھا۔ وہ اکثر رسالے، اخبار اور کتابیں بغل میں دبائے ہوئے ٹول جھول سا پھرتا رہتا تھا۔ اِس زمانہ میں اُسے صفائی بہت پسند تھی، اِس لئے اُس کے کپڑے بہت اُجلے ہوتے تھے۔ وہ داڑھی مونچھ دونوں صاف کرایا کرتا تھا، اور اس نے سر کے بال کندھوں تک بڑھائے ہوئے تھے۔ وہ پنجاب پبلک لائبریری میں اوورکوٹ پہن کر جایا کرتا جس میں اس نے بہت سی کتابیں چھُپا کر چرائی تھیں، مگر بعد میں اُنہیں واپس بھی کر دیا تھا۔

اُس نے ادب میں اتنی دسترس حاصل کر لی تھی کہ وہ مولینا صلاح الدین کے "ادبی دنیا" میں تیس روپیہ ماہوار کا نوکر ہو گیا تھا۔ ادبی دنیا کے مُدیر و مالک مولانا صلاح الدین کے منشی مہتاب دین والد ثناء اللہ عرف میرا جی سے تعلقات تھے اور ان کا کلام بھی رسالہ میں چھپتا رہتا تھا۔ سنا ہے کہ مولینا صلاح الدین، منشی مہتاب دین کے مقروض تھے اور منشی صاحب نے اپنے لڑکے کو اس قرض کے عوض رسالہ میں نوکری دلوا دی تھی۔

یہ اسی زمانہ کا ذکر ہے جب ثناء اللہ ایک صحافی مسٹر خلیل کے توسط سے ایم۔ اے۔ (انگلش) کے طالبِ علم مسٹر کلیم کے پاس پہنچا تھا۔ کہ وہ اُسے میرا سین کی وہ تصویر حوالہ کر دے جو مسٹر کلیم کے ساتھ ایف۔ سی۔ کالج کی ایک تقریب میں بطور گروپ لی گئی تھی۔ مسٹر کلیم اس عجیب الخلقت انسان کو دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ سر پر پٹوں سے بڑے بڑے بال، ماتھے پر رولی اور گلے میں جنیو۔ ثناء اللہ کی خواہش پوری کر دی گئی تھی۔

اسی مسٹر کلیم کے پاس میرا سین کا ایک شیدائی ڈی۔ این۔ گُکھن آیا تھا۔ میرا اس ہندو لڑکے کی ہم جماعت تھی یہ اس کے لئے بے حد تڑپ رہا تھا کیونکہ بوجہ بیماری وہ گھر سے باہر نہیں نکلی تھی۔

حصّہ دوم

ڈی۔ان۔ کلہن، مسٹر کلیم کو مزاج پرسی کے بہانے بنگالی بلڈنگ لے کر گیا تھا۔ میرا کے باپ نے جو ملٹری اکاؤنٹ میں افسری کے عہدہ پہ تھا۔ ان دونوں کو میرا سے ملنے کی اجازت دے دی تھی۔

یہ دونوں میرا کے پاس پہنچے۔ تو اسے صاحبۂ خراش پایا۔ اس کے گورے گورے گال تپ سے سرخ سرخ ہو رہے تھے۔ لیکن وہ نحیف نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ اس پہ تو گویا شباب آیا ہوا تھا جسکی لالی چہرے سے گویا پھٹی پڑ رہی تھی۔ اتنا جوبن تو گویا میرا پر کبھی بھی نہیں آتا ہوگا۔ اور یہ بنگالن گویا بادجکہ[1] سے بہت ہی بیتاب نظر آ رہی تھی۔ ڈی۔این۔ کلہن کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ میرا کے ساتھ لیٹ جائے۔ کبھی یہ میرا کے اوپر ہو، تو کبھی میرا اسکے اوپر۔ یہ دونوں ایک دوسرے کو بہت دیر تک اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتے رہیں۔ اگر میرا اس بھینچا بھینچی پر کبھی منہ بنائے، تو بھینچا بھینچی میں اضافہ ہوتا رہے۔

ڈی این۔ کلہن ایسا تو نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس نے تپ دیکھنے کے

---

[1] بادجکہ: (فارسی) عورت کو مرد کے لئے خواہش۔

بہانے اپنا ہاتھ میرا کے ہاتھ پر رکھ دیا تھا۔ اس کے تمام جسم میں بجلی سی دوڑ گئی تھی۔ اس جذبہ میں وہ اپنا ہاتھ میرا کے ہاتھ سے نہ ہٹا سکا، یہاں تک مریضہ خود اپنا ہاتھ سکوڑنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

مسٹر کلیم فوٹو کے اس گروپ میں موجود تھا جس میں میرا سین بھی تھی۔ یہ اور ایک دیگر دیسی عیسائی لڑکی بھی جو مسٹر کلیم کے کہنے پر گروپ میں شامل کی گئی تھی۔ ثناء اللہ اس کُل گروپ کی فوٹو حاصل کرنا چاہتا تھا

۹

بعد میں مسٹر کلیم کو ملٹری اکاؤنٹ میں ایک اونچی ملازمت مل گئی تھی اور میرا کا باپ درگا پرشاد سین، مسٹر کلیم کے پاس اپنی پنشن کے معاملہ میں مسٹر کلیم کے گھر لٹن روڈ پر پہنچا تھا۔ اُسے امید تھی کہ مسٹر کلیم جس نے میرا کی مزاج پرسی کی تھی، ضرور اُسکی مدد کرے گا۔

خیر ثناء اللہ نے مسٹر کلیم سے میرا جی کی گروپ تصویر حاصل کر لی تھی۔ بعد میں جب ثناء اللہ میرا جی کو یہ معلومات ہوئی کہ ایک ابھرتے ہوئے شاعر قیوم نذر، میرا سین کے ٹیوٹوریل گروپ میں شامل تھا، اور اس کے پاس بھی بطور ایف سی کالج کے طالب علم کے میرا سین کی گروپ تصویر تھی، تو میرا جی نے قیوم کو بھی مجبور کر دیا تھا کہ وہ تصویر بھی اُسے سونپ دے۔

میرا جی نے مسٹر کلیم والی اور قیوم نذر والی دونوں تصویروں کو گروپ سے کاٹ کر انلارج کرالی تھیں۔ اپنے جسم کے ذریعہ نہ سہی مگر میرا سین ان تصویروں کے ذریعہ ثناء اللہ سے پھر نبیٹ ہوتی رہتی تھی۔

لاہور میں ثناء اللہ میرا جی کے ساعات نہایت سنگین گزر رہے تھے۔ ایک تو اسکی آمدنی بہت قلیل تھی، دوسرے بنگالی بلڈنگ، ایف۔ سی۔ کالج اور

جن راستوں سے میراسین گزرا کرتی تھی، اسکی ژولیدگی بڑھاتے رہتے تھے۔ وہ غم غلط کرنے کے لئے شراب پیا کرتا تھا۔ اچھی شراب تو اُسے کہاں میسّر تھی وہ ٹھرّے پر ہی گزر کرتا تھا۔

شروع شروع میں اُسے بیر کی عادت پڑ گئی تھی، جو وہ گوالمنڈی کے بھولہ ناتھ سے خریدا کرتا تھا۔ بھولہ ناتھ کے پاس سری بھوری کی ٹھیکہ داری تھی اور یہ بیر کی بوتل ساڑھے چار آنے میں بیچتا تھا۔ میراجی کی لغت میں بیر بھولہ ناتھ کی داشتہ پکاری جاتی تھی۔ یہ شاعری میرا کی تصویر، بیر یا شراب سامنے رکھ کر کیا کرتا تھا۔

ثناء اللہ اُس دکان سے بھی شراب خریدا کرتا تھا۔ جو انارکلی کے جنوبی مدخل سے کچھ فاصلہ پر مغرب میں تھی۔ وہ ادھر سے گزرتا تو لڑکے اُسے دیکھ کر میراسین، میراسین" کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ ثناء اللہ یہ نعرے سُن کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ اب تک لوگ اُسے بطور شاعر سامری کے تخلّص سے جانتے تھے۔ یہ نعرے سُن سُن اُس نے اپنا تخلص مستقل طور پر میراجی اختیار کر لیا تھا۔

۱۰

جو تیس روپیہ میراجی کو "ادبی دنیا" سے ملتے تھے۔ اُن میں سے پندرہ روپے وہ اپنی ماں کو دے دیا کرتا تھا۔ اس طرح سے اُسے آٹھ آنے یومیہ کی فت تھی۔ میرجی کی ماں کو بھی اپنے اس بیٹے کا بڑا خیال تھا۔ وہ اس کے عورتوں جیسے اس طرح دھویا کرتی تھی۔ جیسے وہ لڑکی کہ جیسے وہ لڑکی ہو، اور تیل لگا کر کنگھی کرنے کے بعد مانگ نکالا کرتی تھی۔ لمبے بال اُسے خوب سجتے تھے۔ ویسے میراجی خوش شکل بھی تھا۔ کھلتا ہوا گیہواں رنگ، تیکھی ناک، منہ کا دہانہ چھوٹا، پتلے ہونٹ، بڑی بڑی چمکدار آنکھیں، اوسط سے کچھ کم قد،

چھریرا بدن۔

مزنگ کے اوباش اس پہ فقرہ کسا کرتے تھے! ''میم شاحب'' (میم صاحب) وہ جواب دیا کرتا تھا ''میرا آگا تو دیکھ لو، میں میم شاحب'' (میم صاحب) ہوں یا نرا شاحب (صاحب)۔

میراجی نیچے درجہ کا، دو آنے، کا ٹکٹ خرید کر فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ اُس کے خیال میں بازارِ حسن جانا بُری بات تھی، مگر وہ پھر بھی ایک دوست کے ساتھ وہاں جایا کرتا تھا۔ شاہد بازاری کو دینے کے لئے اُسکی جیب میں تھوڑے ہی دام ہوتے تھے، باقی زائد روپیہ وہ رمینگٹن رینڈ کی ڈبیہ میں ایک دوست کے پاس رہتے تھے۔

جب میراجی ہمیشہ کو لاہور چھوڑ گیا، تو اُسکے ایک امریکہ سے لوٹے ہوئے دوست کی خواہش ہوئی کہ وہ میراجی کے شاہد بازار کو دیکھے۔ امریکہ پلٹ دوست اور رمینگٹن رینڈ کی ڈبیہ والا اُس پتلی گلی میں پہنچے جہاں میراجی کے شاہدِ بازار کا ڈیرہ تھا۔ جاتے ہی پہلے دوست کے منہ سے یہ الفاظ نکلے کہ میراجی باقی رقم اسے ہی پکڑا دیا۔ یہ سنتے ہی عورت نے ناک بھوں چڑھائی اور کہا: ''کیا آپ کنگلے کے خزانچی تھے'' عورت تو لڑنے کو تیار ہو گئی تھی مگر امریکہ پلٹ دوست نے عورت کو پانچ روپے منہ جُھلس کر ٹھنڈا کیا تھا۔

لاہور میں میراجی کو اچھا نقاد سمجھتے تھے اور وہ لارنس گارڈن جاکر دوستوں سے علمی مباحثے کیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ ڈبیہ والے دوست نے میراجی کو اپنا ایک گیت دے کر'' ادبی دنیا'' میں شائع کرانے کی خواہش کی۔ میراجی نے یہ گیت ''ادبی دنیا'' میں نہ چھاپا تو دوست نے شکایت کی، جس پہ میراجی بولا کہ یہ گیت ''ہمایوں'' میں چھپنا چاہیئے تاکہ یہ تعریفی تنقید کر سکے، کیونکہ ''ادبی دنیا'' میں چھپتا، تو یہ تعریفی تنقید نہ کر سکتا تھا۔

۱۱

ڈبیا والے دوست کی دلچسپی صرف گیتوں سے تھی اور نقاد کہا کرتے تھے کہ گیت تو ڈوموں اور بھانڈوں کے لئے ہوتے ہیں، اور اسے غزلیں لکھنا چاہیئے۔ پھر ایک کتاب "گیت مالا" مولانا صلاح الدین اور میراجی کے تعاون سے چھپی اس میں زیادہ گیت اندرجیت شرما کے تھے مگر ایک گیت ڈبیا والے کا بھی تھا۔ اس کتاب پر میراجی کا نام دیکھ کر اسی شاہد بازار کو اِس کتاب کی طلب پیدا ہو گئی۔ اُس نے اس کتاب کو بازار سے خریدا مگر میراجی اور ڈبیہ والے دوست کے روبرو اُسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھینک دی، مگر ساتھ یہ بھی کہا کہ اِس کتاب کے تمام گیت، سوائے ایک کے اکارت ہیں، کیونکہ وہ ٹھیک پر ٹھیک نہیں بیٹھتے۔ اور وہ گیت جو شاہدِ بازار کو بھا گیا تھا، وہ ڈبیہ والے کی تصنیف تھی۔ شاہدِ بازار نے یہ گیت بڑی چٹک مٹک کے ساتھ گایا تھا۔

ایک مرتبہ ڈبیہ والا میراجی کے پاس گیا، تو دیکھا کہ ایک لڑکی کوٹھے پر کھڑی بال سکھا رہی ہے، اور میراجی یہ بول گنگنا رہا تھا ؎

آج اشنان کیا گوری نے
آج بھلا کیوں نہائی

اس لڑکی سے متاثر ہو کر میراجی نے ایک جنسی نظم "نفسِ مُہیب" لکھی تھی، جسے مولینا حامد علی خاں نے ہمایوں میں طبع کیا تھا۔ میراجی کا ارادہ چتوڑ راجپوتانہ کی دھامک شاعرہ میرا بائی میر میراسین کی نسبت سے ایک کتاب بھی تصنیف کرنے کا تھا۔ اُس نے ایک کتاب اس پر تحریر کی تھی کہ شعر کے گُن کس طرح سے جانے جا سکتے ہیں۔ اس کتاب کا شمار

تنقید کی بہترین کتابوں میں ہے۔ اور اُسے اردو تنقید کا سرکن[1] و سرہنگ[2] ماننے لگے تھے۔

اب میراجی نے "ادبی دنیا" کی نوکری چھوڑ دی تھی کیونکہ اُسے آل انڈیا ریڈیو لاہور میں کام مل گیا تھا۔ یہاں اُس نے ایک نئے پروگرام "سرابات" کی طرح ڈالی تھی جس میں فیض احمد فیض، سالک، اور دینا ناتھ جیسے ادیب حصہ لیتے تھے۔ میراجی ہی اصل میں حلقۂ اربابِ ذوق کا موسس تھا جس میں غزلوں، نظموں، افسانوں وغیرہ پر تنقید ہوتی تھی، اور اُسکی نشستیں وہ اپنے مزنگ والے گھر میں منعقد کراتا تھا۔ اس کی یہ داغ بیل ڈالی ہوئی لاہور اور پاکستان کے مختلف شہروں میں اب بھی موجود ہے۔

جب میراجی "ادبی دنیا" سے علیحدہ ہوا، تو اُس نے مولٰینا صلاح الدین سے سفارش کر کے اپنے ڈبیا والے دوست کو اپنی جگہ رکھوا دیا تھا

ریڈیو پر محمود نظامی، ڈائریکٹر آل انڈیا ریڈیو لاہور نے میراجی کو جگہ دی تھی، اور جب وہ دہلی تبدیل ہو گئے، تو اُنھوں نے میراجی کے لئے وہاں ڈھائی سو روپے ماہوار کی آسامی نکال دی تھی۔

دہلی جانے سے پہلے میراجی نے زادِ راہ کے لئے اپنی کتاب "میراجی کے گیت"، مکتبۂ اردو کو پچاس روپیہ میں فروخت کر دی تھی۔ جب وہ رخصت ہونے کے لئے ڈبیہ والے دوست کے پاس ۴۔ جمال پارک، عزیز روڈ، مصری شاہ لاہور گیا تو اُس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ کیونکہ اُس نے شراب پی کر میراسین کا نام لیتے ہوئے رو رو کر اپنا سر دیوار سے اتنا پھوڑا تھا کہ زخم ہو گئے تھے۔ ڈبیہ والے دوست نے میراجی سے کہا تھا: "تو نے خود کو اُس بنگالن کیلئے

---

[1] سرکن : سردار

[2] سرہنگ : افسر فوج

اتنا تباہ کر لیا کہ تجھے سر کے زخموں پر پٹی باندھنا پڑی" اس پر میرا جی نے جواب دیا تھا! "وہ چیپڑ، چیپڑ، چیپڑ سہی، پر میرا اُس پر دل آیا ہُوا ہے، آیا ہوا ہے، آیا ہُوا ہے۔" ڈبہ والے دوست نے میرا جی کے ہاتھ میں پنے چڑھے ہوئے دو لوہے کے گولے بھی دیکھے تو کہا: "ان گولوں کی نمائش دہلی میں مت کرنا۔" تو اس نے انکا جواز اس طرح سے پیش کیا تھا: "یہ گولے میری جان کے ساتھ ہیں۔ جب مجھے وہ یاد آتی ہے۔ اور دلوار پاس نہیں ہوتی، تو یہ گولے ہی اپنے سر میں مار لیتا ہوں اسی طرح سے میں نے میرا سین کی تصویر بھی رکھی ہوئی ہے: تاکہ جب چاہوں دیکھ سکوں۔ گو وہ لوہا یا مدار نہیں لیکن میرے لئے تو لوہا یا مدار اسے بھی سوا ہے۔"

دوسرا باب

دہلی

تو جب میرا جی کو محمود نظامی کے توسط سے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں ڈھائی سو کی مل گئی تھی، تو وہ دہلی چلا آیا تھا۔ اُس کے ساتھ جستی ٹرنک میں میرا سین کی گروپ علیحدہ کرا کر انلارج کی ہوئی تصویر بھی تھی۔ دہلی میں چونکہ اُس کی آمدنی اچھی تھی، اس لیے وہ ماں کو رقم بھیج کر باقی سے سٹّرا اڑایا کرتا تھا۔ اُسکے لُول جھل پتے اور سڑی پتے میں یہاں بھی کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ کبھی وہ پَلی مار ان کے پاس چاندنی چوک میں گھنٹہ گھر کی بلندی کا جائزہ سا لیتا رہتا۔ اور کبھی لال قلعہ کے شمالی لاہوری دروازہ سے جنوبی اجمیری دروازہ تک کی مسافت بار بار طے کرتا۔ وہ خاص طور پر اجمیری دروازہ کے ویران اور بلند پھاٹک دیکھ دیکھ کر سوچا کرتا تھا۔ کہ جس طرح سے اس جنوبی پھاٹک کے کواڑ ہمیشہ کو بند ہو گئے ہیں، اسی طرح سے وہ بھی میرا سین کو کبھی نہیں دیکھ سکے گا۔ اُسکی نگاہیں سُنہری مسجد کے پاس کھڑے ہوئے خشک نا رنجی برگ فوارہ پر ہوتی تھیں۔ کیونکہ جس طرح سے اس فوّارہ کا پانی سوکھ گیا تھا اسی طرح اِسکی آنکھوں کی نمی بھی محو ہو گئی تھی۔

وہ مقبرہ صفدر جنگ اور مقبرہ ہمایوں پر فرو ماندہ[1] اور سخافت[2] زدہ سا جا جا کر بیٹھ جاتا۔ یہاں اُسے بلا ضرورت ہی سر کھجانے کی عادت پڑ گئی تھی۔ یہاں بھی وہ اپنے ماتھے پر رولی سجائے رکھتا تھا۔ گلے میں کالے دانوں کی جنیو اور مونگوں

---

[1] فرو ماندہ : تھکا ہوا۔ عاجز۔

[2] سخافت : بے حوصلگی۔

کی مالا۔ وہ صبح صبح جمنا کے کنارے سورج پوجا بھی کیا کرتا تھا۔ اس نے گویا اِس طرح میرا سین سے اپنی نسبت قائم کی ہوئی تھی۔

اب وہ ہندو دیو مالا کا مطالعہ کثرت سے کرنے لگا تھا اور اُسکی تحریروں میں بھی ہندی اور سنسکرت کے الفاظ کی بہتات ہو گئی تھی۔

جس طرح سے وہ لاہور کی میاں میر نہر کے ہریالے کنارے بیٹھا سمرنی جپا کرتا تھا یہی عادت اس نے دہلی میں بھی جاری رکھی تھی۔ وہ سمرنی لئے ہوئے لال قلعہ کے مشرق میں جمنا کے کنارے پہنچا کرتا تھا۔ یہاں اس نے مورتی پوجا بھی شروع کر دی تھی۔ وہ میرا سین کی تصویر کو جمنا کے کنارے کسی درخت پر لگائے اُسے دیکھ کر سجدے پر سجدے کیا کرتا تھا۔ ریڈیو اسٹیشن سے اپنی جائے قیام کو جاتے ہوئے میرا سین کی تصویر کے لئے اُسکی یہ حالت ہوتی تھی کہ جیسے وہاں خود میرا سین اُسکا انتظار کر رہی ہو۔

اب اُسے چار دانگ عالم میں میراجی ہی کہتے تھے۔ وہ اپنے باپ، منشی مہتاب دین، ریلوے انجینئر، کے رکھے ہوئے نام محمد ثناء اللہ ڈار، سے قطعی بے تعلق ہو گیا تھا۔ اُسکی پیدائش گجرات (کاٹھیاواڑ) میں ہوئی تھی۔ وہ باپ کی بدلیوں کے ساتھ ساتھ چمن، سانگھر، جیکب آباد میں قیام کرتا رہا تھا۔ اسے اُس کے ہم جماعت محمد ثناء اللہ ہی جانتے تھے۔ وہ اچھا گا لیا کرتا تھا۔ اور اُس نے اسکول کے ڈراموں میں بھی حصے لئے تھے۔ اس وقت اُس نے شاعری میں اپنا تخلص ساسری رکھا ہوا تھا۔

بعد میں اُس نے عمر خیام کی فٹز جیرلڈ والی رباعیات کو اُردو نظم میں بہ عنوان "خیمہ کے آس پاس، ڈھالیں، تو اُن میں ہندی الفاظ بکثرت استعمال کئے۔ مثلاً سیت کال، سورگ، جیوتی، رجنی، جیون، مدیرا، بھور، اور کامنا۔ ایسے الفاظ اُسکی ابتدائی شاعری میں مفقود تھے۔

۱۲

اگرچہ فٹز جیرلڈ کا ترجمہ متظلم[1] کی فریاد ہی فریاد ہے۔ لیکن میراجی کے ترجمہ کو دو آتشہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ عمر خیام میں واقعی پژمردگی، یاس اور پیاس ہے، مگر میراجی نے اپنے ترجمہ میں زیادہ ہی قنوطیت بھر دی تھی۔ لیکن میراجی کے یہ دونوں پیش رو، عمر خیام، فٹز جیرلڈ عسیلہ[2] کے اتنے متعطش[3] نظر نہیں آتے جتنا یہ ہے۔ ایک رباعی کا ترجمہ اُس نے اس طرح کیا ہے ؎

سُن لو بھائی کیسے اُن سے میں نے اپنا آپ چھپایا
آنکھ جھپکتے اپنے گھر میں ایسے دوسرا بیاہ رچایا
سُوجھ بُوجھ بُوڑھی باندی تھی سیج سے ہاتھ پکڑ کے ہٹایا
سُندر پیاری نگوری کو اپنے من کی دُلہن بنایا

شراب تو میراجی بہت پی رہا تھا۔ اور وہ بھی بِلا سوڈا واٹر کی ملاوٹ کے، لیکن اُسے عِسیلہ کی زیادہ ہی خواہش تھی۔ پر اُسے یہ بھی تو ڈر لگا رہتا تھا کہ شاید میں مِل جاؤں پہلے بیتے سالوں میں۔

دہلی پہنچنے کے بعد بھی میراجی کی شاہد بازیاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ یہاں اس نے تین لڑکیوں کو اپنا نشانہ بنانا چاہا تھا۔ ان میں سے ایک لوجلد بہاری والی پچیس سالہ ڈراما آرٹسٹ صفیہ مُعینی تھی۔ اس دوشیزہ کا قد ساڑھے پانچ

---

[1] متظلم: جس پر ظلم ہوا ہو۔

[2] عسیلہ: لذتِ جماع

[3] مُتعطش: پیاسے جسے پیاس لگی ہوئی ہو۔

فٹ ہوگا۔ آنکھیں دریپی اور تعلیم مڈل تک۔ گردن ذرا لانبی، ہونٹ ذرا دبیر لیکن رس لئے ہوئے۔ اُسکی آواز میں لتا منگیشکر یا آشا بھوسلے سے بھی زیادہ مٹھاس تھا۔ اس کی شلوار اور قمیض سے اس کی سوڈولتا[1] پھٹی پڑا کرتی تھی۔ دبلے اُسکا بدن چھریرا سا تھا۔ یہ لڑکی سَمرت[2] اور دبیل[3] سی تھی۔
بوجلہ پہاڑی کا جائے وقوع چتلی قبر کی طرف تھا، اور بلندی تقریباً سو فٹ۔ اسکے مکان ایک ہی قسم کے عزیبا ماڈے سے تھے۔ اِدھر ہی اندھیری گلی، گلی اڈن، بازار سیتا رام، مطب حکیم بقائی، حویلی اعظم خاں تھی اور ادھر ہی سے ترکمان دروازہ کو راستہ جاتا تھا۔

میرا جی پوچھتا پوچھتا بوجلہ پہاڑی پہنچا مگر اُسے صَفیہ مُعینی کے گھر کی معلومات نہ ہو سکی۔ وہ اُدھر سرڑی سا بنا ہوا غالبؔ کا یہ شعر پڑھتا ہوا پھرتا تھا۔؎

دلۓ دیوانگیٔ شوق کہ ہر دم مجھکو
آپ جانا اُدھر، اور آپ ہی حیران ہونا

دوسری لڑکی جس پر میرا جی کی زیادہ ہی طبیعت آئی ہوئی تھی۔ اُس کا قد کچھ پست تھا، رنگ کھلتی ہوئی سانولی، اور بدن بھرا بھرا۔ اُسکی کمر پر بھی بوجلہ پہاڑی والی صفیہ مُعینی کی طرح سے لمبی، موٹی، سیاہ چوٹی پڑی رہتی تھی۔ جس میں سانپ کی سُرخ زبان کی طرح مُوبافت ہوتا تھا۔ اس لڑکی کی بے حد خوبصورت آنکھیں میرا جی کے لئے جلوہ گاہ تھیں۔ آل انڈیا ریڈیو۔ دہلی کو فخر تھا کہ اُسے ایسی شیریں مقال اناؤنسر نصیب ہوئی تھی۔ میرا جی کے تعلقات

---

[1] سوڈولتا: سڈول پن۔

[2] سمرت: دوستی کی طرف مائل۔

[3] دبیل: دوسرے کے ماتحت۔

سب سے زیادہ اِسی شاعرہ 'سحاب قزل باش' سے تھے۔ اور یہ آغا قزل باش 'شاعر' کی چشم و چراغ تھی۔

تیسری لڑکی ملکۂ حسن، تیس سالہ مسز حمید حسین تھی۔ اور حمید حسین اُس کا برائے نام شوہر تھا۔ ایسی عورت کو جو سُرخ و سفید ہونے کے ساتھ لمبی چوٹی، اور بڑی بڑی آنکھوں والی ہو، عربی میں حُور کہتے ہیں۔ تو مسز حمید حسین ایسی ہی حُسن پری تھی۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی کی کسی بھی لڑکی کو اُسکے جوڑ اور ملتی کی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ VD3

میراجی کی حالت ان تینوں حسن پاروں کے لئے بجائے ہِلاس[1] بِلاس[2] کے دِلاس[3] کی تھی۔ وہ ریڈیو اسٹیشن پر اِن ہی کی راہ تکتا رہتا تھا۔ اسکی دلچسپی صرف انکی انتظاری رہ گئی تھی۔ ان تینوں لڑکیوں کا استجلاب[4]، ریڈیو پر آنے والی سب لڑکیوں سے بڑھا ہوا تھا۔ میراجی کی نیت ان تینوں کو مرکوب[5] بنانے کی تھی۔ مگر ایسا نہ کر سکنے پر اُس نے اپنی ہیئت استغراقی بنالی تھی۔

ریڈیو اسٹیشن پر مسودہ نگار اور فاخر میراجی کا کافی احترام تھا۔ اور جب وہ بمبئی اس لئے جانے لگا کہ وہاں فلمی دنیا سے منسلک ہو جائے۔ تو نوشا نوشی کی محفل گرم ہوئی تھی، مگر یہاں صفیہ معینی، سحاب قزلباش اور حُسن پری مسز حمید حسین غائب تھیں، اور میراجی استغراق میں آکر رہ گیا تھا۔ اہلِ محفل اُس کے ساتھ طرّاحی پر اترے ہوئے تھے، مگر وہ چُپ چُپ تھا۔ ویسے میراجی کو چھینکا چڑھانے کی کبھی نوبت نہیں آسکتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے ڈرپوک پنے

[1] ہِلاس: خوشی کے کھیل۔

[2] بِلاس: خوشی

[3] دِلاس: گریہ

[4] استجلاب: اپنی طرف کھینچ لینے کی طاقت۔

[5] مرکوب: جس پر سواری کی جائے۔

کے سبب کبھی حد سے آگے نہیں بڑھتا تھا۔ اسے احتراز نہیں کہہ سکتے تھے بلکہ مجبوری۔

۱۳

میراجی کی دہلوی پریم کہانیاں بلاگلی قاسم جان کی ایک لقۂ نور سوداگر بچی، عقمہ، کے ذکر اذکار بغیر مکمل نہیں ہو سکتیں۔ یہاں اس نے شراب کے ساتھ عِشیان[1] کے اشتراک کی پوری کوشش کی تھی۔ وہ عقمہ کو اپنی عشیقہ[2] بنا کر اس لڑکی سے عُسیلہ[3] کا خواہش مند تھا۔

عقمہ کو اردو کی خاصی استعداد تھی اور اسے ادب کا شوق بھی تھا۔ جس کی وجہ یہ تھی کہ ایک ہندو دیوی دیال کا نطفہ تھی، جو دہلی کے سینٹ اسٹیفن کالج میں اردو کا پروفیسر اور بڑا متموّل تھا۔ چاندنی چوک میں آٹھ کشادہ دکانیں اسکی ملکیت تھیں۔ اسکا امیرانہ بنگلہ، رشی بھون، اُس رج (چھوٹی پہاڑی) کے جنوب میں تھا۔ جہاں انگریزوں نے ۱۸۵۷ء میں بلوائیوں کو شکست دی تھی اُسکے پاس کافی بینک بیلنس تھا۔ اور تنخواہ کے علاوہ بھی اُسکی دافر آمدنی تھی۔

اقمہ[4] یا عقمہ[5] کا ظاہرا باپ اپنے ہی دروازہ کے آگے آواز لگا کر محض بطور دکھاوٹ کے گنڈیریاں بیچا کرتا تھا۔ جس کی بیوی ایک زیتون رنگ،

---

[1] عِشیان : جماع

[2] عشیقہ : معشوقہ

[3] عُسیلہ : لذت جماع

[4] اقمہ : بہت سفید

[5] عقمہ : سُرخ کپڑا۔ نقش - رنگکاری کی ایک قسم۔

پیلی، طریف[1] و طریر[2] مگر کثیر الاولاد عورت تھی۔
گھر کا خرچہ عقمہ جسکا دوسرا نام اقمہ بھی تھا، کے ذمہ تھا جو وہ پروفیسر دلوی دیال کی داد و دہش سے چلاتی تھی، جس نے اِسے بطور مستقل رکھوری[3] کے رکھا ہوا تھا۔ گنڈیری فردوش کی زندگی خوب چرب آخوری[4] میں بسر ہو رہی تھی۔ اُس کے گھر میں بجلی اور بیٹری سے چلنے والے ریڈیو سیٹ بھی تھے، پیڈسٹل اور چھت کے پنکھے بھی۔ گھر میں روز گوشت پکتا تھا اور بچے مٹھائیاں بھی کھاتے تھے۔ عقمہ اپنے ناجائز باپ کی متمثّل[5] تھی، وہ اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ اسی نے اِسے اُردو کی تعلیم بھی دلائی تھی۔ اُسی نے اِسکا مسلمان نام اقمہ رکھا تھا، جس کے معنی بہت سفید کے ہیں۔ ماں اِسے اکثر "سوداگر بچی" کہا کرتی تھی۔ سوداگر بچہ بڑے سوداگر کو کہتے ہیں۔ پروفیسر اُسکے لئے اُجلی آمدنی کا بندوبست بھی کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مہلت نہ دی۔ باپ بھی اُسے "سوداگر بچی" ہی پکارا کرتا تھا۔
پروفیسر دلوی دیال کا تنہا وارث اُسکا اکلوتا بیٹا دمود دیال تھا۔ جسے عقمہ دنادن کہا کرتی تھی۔ اِسے تعلیم سے نفرت تھی اور یہ بدصحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اسکی شکل بھی باپ پر تھی اور یہ اول پہچان اقمہ کا بھائی نظر آیا کرتا تھا۔ یہ دونوں بہت ہی سفید فام تھے۔
پروفیسر دلوی دیال کی فوتیدگی کے بعد عقمہ کی ماں کو گزر اوقات کی

---

[1] طریف : نادر
[2] طریر : حسین
[3] رکھوری : داشتہ
[4] چرب آخوری : ناز و نعم میں گزارا۔
[5] متمثّل : ہم شکل۔

چیبلی، طریف[1] و طریر[2] مگر کثیر الاولاد عورت تھی۔
گھر کا خرچہ عقمہ جسکا دوسرا نام اقمہ بھی تھا، کے ذمہ تھا جو وہ پروفیسر دلوی دیال کی داد و دہش سے چلاتی تھی، جس نے اِسے بطور مستقل رکھوری[3] کے رکھا ہوا تھا۔ گنڈیری فروش کی زندگی خوب چرب آخوری[4] میں بسر ہو رہی تھی۔ اُس کے گھر میں بجلی اور بیٹری سے چلنے والے ریڈیو سیٹ بھی تھے، پیڈسٹل اور چھت کے پنکھے بھی۔ گھر میں روز گوشت پکتا تھا اور بچے مٹھائیاں بھی کھاتے تھے۔ عقمہ اپنے ناجائز باپ کی متمثل[5] تھی، وہ اس سے محبت بھی کرتا تھا۔ اُسی نے اِسے اُردو کی تعلیم بھی دلائی تھی۔ اُسی نے اِسکا مسلمان نام اقمہ رکھا تھا، جس کے معنی بہت سفید کے ہیں۔ ماں اِسے اکثر "سوداگریچی" کہا کرتی تھی۔ سوداگر بچہ بڑے سوداگر کو کہتے ہیں۔ پروفیسر اُسکے لئے اُجلی آمدنی کا بندوبست بھی کرنا چاہتا تھا۔ مگر موت نے مہلت نہ دی۔ باپ بھی اُسے "سوداگریچی" ہی پکارا کرتا تھا۔
پروفیسر دلوی دیال کا تنہا وارث اُسکا اکلوتا بیٹا دمود دیال تھا۔ جسے عقمہ دنادن کہا کرتی تھی۔ اِسے تعلیم سے نفرت تھی اور یہ بد صحبت میں بیٹھا کرتا تھا۔ اسکی شکل بھی باپ پر تھی اور یہ اول پہچان اقمہ کا بھائی نظر آیا کرتا تھا۔ یہ دونوں بہت ہی سفید فام تھے۔
پروفیسر دلوی دیال کی فوتیدگی کے بعد عقمہ کی ماں کو گزر اوقات کی

---

[1] طریف : نادر

[2] طریر : حسین

[3] رکھوری : داشتہ

[4] چرب آخوری : نازو نعم میں گزارا۔

[5] متمثل : ہم شکل۔

بڑی فکر پیدا ہو گئی تھی۔ الحالی کے سبب اس خاندان کا معیارِ زندگی اونچا ہو گیا تھا جس کے لئے زیادہ روپیہ کی ضرورت تھی۔ سگھڑ عورت نے یہ طریقہ نکالا تھا کہ اس نے اپنی ہی جانی کو جو پندرہ بیس سے تھی، اُسی کے سوتیلے بھائی دمودر سے تھتی کرنے کی تدبیر کر لی تھی۔ یہ لڑکا اوباش تو تھا ہی اس نے عقمہ سے مُتلَذِذ ہونے کی ٹھان لی تھی۔ اب تو گنڈیری والے کے زیادہ ہی الٹے تلّے ہونے لگے تھے کیونکہ دمودر باپ کی دولت دونوں ہاتھوں سے لُٹا رہا تھا۔ اور عقمہ کی ماں اپنی بیٹی کی پوری قوّادہ[1] بن گئی تھی۔ دمودر کی بیوہ ماں کو بنگلہ کا نوجوان مالی کھینچا کرتا تھا اور یہ دونوں دمودر دیال کے ہاتھوں خلوت کرتے ہوئے پکڑے بھی گئے تھے۔

۱۴

بس اس کے بعد تو عقمہ اپنے دوست سے مسکوک[2] ہونے کے لئے بنگلہ میں بلا روک ٹوک اُترنے لگی تھی۔ یہیں عقمہ نے میراجی کی کتاب "دو خیمہ کے آس پاس" کو بھی دیکھا جو بڑی آب و تاب سے شائع ہوئی تھی، اور اس لڑکی کے دل میں میراجی سے ملاقی ہونے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ سوداگر بچی نے میراجی کے پاس تعریفی نامہ بھیج کر تمہیدِ ملاقات پیدا کی تھی۔

ان دنوں میراجی کے منہ پر ابابیل کے پر دل جیسی بدنما مونچھیں ہوا کرتی تھیں جنہیں دیکھ کر عقمہ نے بطور استہزا کہا تھا: کیا آپ نے یہ مونچھیں فخاوت[3]

---

[1] قوادہ : دلال۔

[2] مسکوک : سِکّہ لگا ہوا۔

[3] فخاوت : بڑائی۔ عزت۔

کے لئے رکھی ہوئی ہیں ؟

میراجی : فخاوت کے لئے نہیں۔

عقمہ : تو پھر ڈرانے کے لئے ؟

میراجی : اس لئے بھی نہیں۔

عقمہ : تو پھر کس لئے ؟

میراجی : بس یوں ہی۔

عقمہ : اور یہ آپ کا نام کیا ہے۔ بڑا ہی ہندوانہ۔ یہ کبھی یوں ہی ہے ؟

میراجی : یہ یوں ہی نہیں ہے

عقمہ : تو یہ کیونکر ہے ؟

اب میراجی گول مول[1] ہو کر رہ گیا تھا۔ عقمہ نے پھر دریا : "گلے جنیو اور مونگوں کی مالا ، ماتھے ، رولی اور نام میراجی۔ اور آپ ہیں کیا ؟ واقعی کوئی وجہ تو ہو گی جو آپ نے نام اور حلیے یوں بگاڑے۔ گو آپ شیو روز کرتے ہیں

---

[1] گول مول ہونا : خاموش ہونا۔

پر یہ لمبی چوڑی مونچھیں! آپ تو سگا چہ[1] بنے ہوئے ہیں۔ بلکہ پورے جرکین[2] اور منتن[3]،

میراجی: اس کا جواب میں کل پیش کر سکوں گا۔

عقمہ: کل نہیں کسی دن اور ____

وہ یہ کہہ کر چلی گئی، اور باوجود اس استغناء کے میراجی اُسکی انتظاری میں سیسہ کا نگر[4] کے سماں لٹک کر رہ گیا تھا۔ اس نے پندرہ دن اپنے ہیں درو دیوار تکتے ہوئے گزار دئے تھے، لیکن پرتیشا[5] کرنے والی نہ بہوڑی تھی۔ اُسے یقین ہو گیا تھا کہ بجائے اپنے پرتیشے[6] کا پالن کرنے کے اپنے ہی پرتیشے[7] کا بھنگ کرے گی۔ وہ کلپ رہا تھا کہ اگر اسے اُس کے محلہ اور

۱؎ سگا چہ: سوئے ہوئے کے لئے ڈراؤنی شکل۔

۲؎ جرکین: گندا ۳؎ منتن: سڑی ہوئی بدبودار چیز۔

۴؎ سیسہ کا نگر: Plummet: That is a mettle with suspend from a line ایک قسم کی دھات جو لٹکی ہوئی ہو۔

۵؎ پرتیشا: وعدہ ۶؎ پرتیشے کا پالن: وعدہ نبھاہنا۔

۷؎ پرتیشے کا بھنگ: وعدہ خلافی کرنا۔

ٹھور کی خبر ہوتی، تو وہ اُسے بھی میرا سین کی بنگالی بلڈنگ کی طرح سے گرا ڈالتا۔

جس دن سے عقمہ وعدہ کر کے گئی تھی، میراجی نے تو اپنا چولا ہی بدل ڈالا تھا۔ عقمہ کو گئے ہوئے دیر نہیں ہوئی تھی کہ اس نے اپنی ابابیل کے پردں جیسی مونچھوں کا صفایا کرا لیا تھا۔ پہلے اس کے شبو ہیں کئی کئی دن کے باچھےⁱ بھی پڑ جایا کرتے تھے، اب اُسکی داڑھی روز منڈتی تھی۔ وہ مایا دئے ہوئے استری شدہ کپڑے پہننے لگا تھا، جو عطر میں بسائے ہوئے تھے۔

۱۵

میراجی نے ڈبیہ والے دوست کو لاہور خط لکھا تھا کہ اُس کا دِل دِلّی کی ایک سوداگر بچّی سے لگ گیا ہے۔ جس کا جواب آیا تھا کہ یہ اسکی طرف (Advances) پیش رفت کرے۔

یہ مُحرّم کے دن تھے جب گلی قاسم جان کی سوداگر بچی میراجی کے پاس پہنچی۔ اس چمک چاندنی نے ململ کا عباسیⁱⁱ کرتا پہنا ہوا تھا، جس پر ہری پیمک لگی ہوئی تھی۔ اُسکے سر کا دوپٹہ بھی عباسی تھا، اور شلوار نٹ کے بھڑکیلے سفید لٹھے کی۔ اُسکی آنکھیں دُکھ رہی تھیں جن پر اُس نے سیاہ چشمہ لگایا ہوا تھا۔ وہ بیماری سے اُٹھی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ اور اُس نے مانگ میں سیندور رچایا ہوا تھا۔

اُفّو! میراجی نے ایسا حسنِ آشکارا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اِس وقت

ا باچھا: وقفہ

۲ عباسی: سیاہ

تو میرا سین بھی پس پشت سی ہو گئی تھی۔ نہایت گورا چہرہ، لمبی سی گردن پر عباسی کرتا، عباسی ہی اوڑھنی، ٹانگوں میں نٹ کے سفید لٹھے کی شلوار، آنکھوں پر سیاہ چشمہ، میراجی تو اُسے دیکھ کر دھک سے رہ گیا تھا اور موہُت[1] بھی بیماری کے بعد کی تھوڑی سی نقاہت سے اُس کے حسنِ نزاکت میں زیادہ ہی پھبن آگئی تھی۔

عقمہ نے آتے ہی سوال کیا "یہ مونچھیں کہاں اڑ گئیں، پھر سے اڑ گئیں؟"

میراجی: تعمیلِ ارشاد ہوا۔

عقمہ: میں نے تو ایسا کوئی حکم صادر نہیں کیا تھا۔

میراجی: لیکن ترشُح کچھ ایسا ہی ہو رہا تھا۔

عقمہ: جنیو، مالا اور رولی! وہ بھی غائب! کیا ہمیشہ کو غائب؟

میراجی: پہلے ہندو تھا، اب مسلمان ہو گیا ہوں۔ اور آپ کے ہاتھ پر۔

عقمہ: کیا آپ پیدائشی مسلمان نہیں تھے؟

میراجی: تھا۔ لیکن کسی نے مجھے ہندو بنا لیا تھا۔ اب پھر کسی نے مسلمان بنا لیا۔

عقمہ: میں گلی قاسم جان کی سوداگر بچی ہوں۔ مجھے کفر و اسلام سے کیا سروکار۔ بھلا آپ بتا سکیں گے کہ آپ ہندو کیوں ہوئے تھے؟

میراجی: بس جبطرح سے میں اب مسلمان بنا ہوں، اسی طرح سے ہندو بن گیا تھا۔

عقمہ: تو آپ رکابیہ مذہب ہیں۔ کل ہندو تھے اب مسلمان بن گئے، آج مسلمان ہیں تو کل ہندو بن جائیں گے۔!

میراجی: رکابیہ مذہب کہہ کر میری توہین نہ کیجیے۔ البتہ مجھے صابی[2] کہا

---

[1] موہت: مسحور۔ سحر زدہ

[2] صابی: جو ایک مذہب چھوڑ کر دوسرے میں جائے۔

جا سکتا ہے۔ اب میرا ارادہ کبھی اسلام چھوڑنے کا نہیں ہے۔

عقمہ: کیوں نہیں ہے؟

میراجی: کیونکہ جن کے ہاتھوں پر میں نے اسلام قبول کیا، وہ مجھے ترکِ اسلام کی اجازت نہ دیں گے۔

عقمہ: میری اور سے تو آپ ہندو ہیں یا مسلمان، مجھے کوئی سروکار نہیں۔ مگر آپ مسلمان سے جو ہندو بنے تو اُس میں بھی کوئی نکتہ ہوگا۔

میراجی: بس وہی نکتہ جس نے مجھے دوبارہ مسلمان بنالیا۔

عقمہ: جب آپ ہندو بنے تو آپ نے اپنا نام بھی بدل لیا تھا۔

میراجی: جی ہاں۔ پہلے یہی محمد ثناء اللہ کہلاتا تھا، پھر مجھے میراجی کہنے لگے۔

عقمہ: اب پھر محمد ثناء اللہ بن جائیں۔

۱۶

میراجی: اب میں یہ نام کبھی اختیار نہیں کرونگا۔ جو چھوڑ دیا، سو چھوڑ دیا۔

عقمہ: محمد ثناء اللہ کے تو کچھ معنی ہیں، لیکن میراجی کے تو بظاہر کوئی معنی سمجھ میں نہیں آتے۔

میراجی: میرا ایک بنگال کا جادو تھی۔ جی میں نے آدر[1] کے لئے لگا لیا۔

عقمہ: جی کا تو مطلب ہے، مگر میرا مہمل ہے۔

میراجی مہمل تو نہیں، لیکن میں اس سے اِسکے معنی دریافت نہ کرسکا۔ اور وہ اس طرح گم ہو گئی، جسطرح اِسکے معنی گم ہیں۔

عقمہ: تو آپ تو دل پھینک ٹھہرے۔ معاف کیجئے۔ مجھے آپ کے لئے یہ

---

[1] آدر: عزت

سوقیانہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ آپ عشق باز ہیں۔
میراجی : اب میں سوچوں گا کہ جس طرح سے میں نے میرا سین کی مناسبت سے میراجی نام اختیار کیا، اِسی مناسبت سے میں اُسکا نام بھی اختیار کروں، جس نے مجھے دوبارہ مسلمان کیا۔
عقمہ : آپ کی بکباد[۱] نے یہ بتا دیا کہ آپ میں استقامت نہیں۔ مجھے عینُ الیقین ہے کہ جس طرح سے آپ پہلی کا نام چھوڑ کر دوسری ہستی کی مناسبت سے نام اختیار کریں گے۔ یونہی آپ کسی تیسری، چوتھی، پانچویں، چھٹی وغیرہ کی مناسبت سے تیسرا، چوتھا، پانچواں اور چھٹا وغیرہ نام اختیار کرتے وقت دوسری کا نام قضا فرما دیں گے۔
میراجی : یہ عین الیقین[۲]، علم الیقین[۳] پر مبنی ہے۔ یہ حقُ الیقین تو نہیں۔
عقمہ : خیر آپ سگاچہ[۴] نہیں رہے۔ اور آپ نے ہندوانہ نام کی عِلّتِ تامہ بھی بیان کردی ہے۔ یہی آپ کا نام قطرب تجویز کرتی ہوں۔ کیونکہ جسطرح سے وہ کالا کیڑا کہیں اور کبھی قرار نہیں پکڑتا، ایسے ہی آپ بھی ہیں۔
بھلا یہ بھی کوئی تُک ہے کہ آپ پتلون پر شیروانی ڈاٹتے ہیں اور اِس ہیئت کذائی پر بھی آپ کو پٹاخہ بجانے کی فکر ہے۔
عقمہ نے میراجی کے لیے قطرب کا لفظ نفوز میں استعمال کیا تھا۔ اِسے تو سننے والے کو غشی سی آگئی تھی۔ اور اِسے اُتارنے کے لئے وہ اپنے پاس کوئی جمست[۵] بھی نہیں رکھتا تھا۔ پٹاخہ بجانے کے شہدے اور ناشستۂ الفاظ

---

[۱] بکباد : زیادہ بولنا۔ مہا بکو بن جانا - Loquacity
[۲] علم الیقین : بغیر دیکھے یقین [۳] عین الیقین : کامل یقین۔
[۴] سگاچہ : سوتے ہوئے کے لئے کوئی ڈراؤنی شکل۔
[۵] جمست : غشی اُتارنے کے لئے ایک نیلا پتھر۔

سن کر اُس نے تیوری چڑھائی تھی - یہ ایک بازاری سی شے کی بازاری کہن تھی - عقمہ کے آنے کے وقت میرا جی گویا خوشی میں آیا آیا کر رہا تھا - یہ سوداگر بچی بہت ہی سُبک روح تھی - وہ اُس سے کچھ نہ کچھ بے تکلف بھی ہو گیا تھا - بنگال کے شاید عام طور سے سبز رنگ ہوتے ہیں - مگر میرا سین کا رنگ گورا تھا - اسکی طبیعت اُسکے ساتھ بھی انضمام[1] بلکہ انسلاک[2] کو چاہا کرتی تھی - لیکن میرا جی نے کبھی اس کے ساتھ سیدھے منہ سے بات تک تو کیا کبھی بات تک نہیں کی تھی - اس نے اسے اپنا مستقل بنا کر چھوڑ دیا تھا - اُس نے میرا جی کو جاگنے کی بیماری بھی لگا دی تھی -

۱۷

میرا جی اب اس ڈکھڑ بکھڑ میں پڑ گیا تھا کہ میرا سین کے نام سے تو اُس نے آسانی سے کنیت سی اختیار کر لی تھی - لیکن عقمہ کی مناسبت سے اُس کے لئے کوئی نام اختیار کرنا کٹھن نظر آ رہا تھا - دراصل میرا سین اسکے من سانچے کچھ اس طرح سے بیٹھ گئی تھی کہ اسکا محو کرنا ممکنات میں نہیں تھا - وہ تو گویا سامنے کھڑی ہوئی اُسے للو بنا رہی تھی کہ اس ضمن میں وہ جتنا کوشاں ہو گا منزل اُس سے اتنی ہی دُھند ہوتی جائے گی - وُہ تو یہ کہتی ہوئی سنائی دے رہی تھی - کہ اس کا نام چھوڑ کر دوسرا نام اختیار کرنا اُسکی تحقیر ہو گی - اور جس طرح کوروؤں بھائی کی تحقیر کے لئے بھرے دربار میں اُسکی ساڑھی اتارنا چاہ رہے تھے - اور ساڑھی اتنی بڑھتی جا رہی تھی کہ استری کا بے ستر کرنا قطعی ناممکن ہو گیا تھا

---

[1] انضمام : ایک دوسرے میں ضم ہو جانا -

[2] انسلاک : ایک دوسرے کے ساتھ پرو یا جانا -

اسی طرح سے میراجی اِس شاہدِ سبز کو، جو سبز کی بجائے نہایت اجلی تھی،
ایک مرتبہ اپنی من والی بنانے کے بعد اُسے استھاپن سے اتار سکتا تھا۔
دنیا کے کسی عاشق، یا شاعر نے حتّٰی کہ غالب، شیلے یا کیٹس تک نے
اپنا نام چھوڑ کر اپنی محبوبہ کا نام نہیں لیا تھا۔ اور اسے انتہائی آدر سے میرا کے
ساتھ "جی" لگا کر اپنا نام رکھ لیا تھا۔ میرا کے ساتھ آدر میں لفظ جی بڑھا کر اپنا
وہ لشٹم پشٹم سا تو تھا ہی پر ساتھ میجر بھی تھا۔
گو میراجی پر سوداگر بچی کے حُسنِ درخشاں کی مفتونی طاری ہو رہی تھی مگر
میراجی کے مقابل یہ لُوٹے ہوئے تارہ کا چاند نا ثابت ہونے والا تھا۔
عقمہ میراجی کو بھنور جال میں پھنسا کر چلی گئی تھی۔ اُسے ہر وقت یہ خیال
رہنے لگا تھا۔ کہ دیکھئے وہ کب آجائے، وہ اپنا نام عقمہ کے نام پر کس طور
رکھے گا، اور نام رکھنے کی بابت اُسے کیا جواب دے گا۔ ویسے فی الحال اُسے
سوداگر بچی کی بہت لگی ہوئی تھی۔
تو ایک دن جب جیٹھ کی بھر دوپہری میں، جب آسمان آگ برسا رہا تھا،
لُو چل رہی تھی اور میراجی بھولا ناتھ کی دکان سے شراب لے کر لوٹ رہا تھا، کہ
عقمہ اُسے ریلوے کے ڈفرن پل پر ملی۔ اُسکے ساتھ ایک ہندو لڑکا تھا جس کے
بھولپن میں ہنسی گھلی تھی۔ اُسکی پتلیوں سے اُس کے چکر کار[1] تنمبھ کافی نمایاں
ہو رہے تھے۔ اور اسکے ہاتھ میں اسپیئ شراب، شیری، کی بلوری بوتل تھی۔ یہ لڑکا
اقمہ کا سب ماتت بھائی دمودر دیال، تھا۔ یہ دونوں ٹائپ مشین کے نقول معلوم
ہو رہے تھے، یعنی بالکل یکساں۔ عٹ (صفحہ مقابل پر دیکھئے)۔ اپنا میرا یہ
لڑکا واقعی بہت رُوپ شوبھا والا تھا۔ بلوری کوزے جیسا، اور میراجی اُس
کے مقابل جھانولے کے ہم رنگ مٹی کا وہ گھڑا تھا، جس میں شیر فروش

---

[1] چکر کار : گولار

دودھ میلا[1] کر دے، اور گاہک دودھ پینے کے بعد کلھڑ بھُوبیں پھینک کر توڑ دے۔

میراجی کو اپنی بے بضاعتی اور شورہ بختی پر روج[2] آ رہا تھا۔ ہیہات جو طفلِ ہندو تو عمہ کے ساتھ رفث[3] بلکہ لغاء[4] تک کرے، اور میراجی کو اُس کا ایک نقلِ شیریں تک نصیب نہ ہو۔

میراجی سوداگر بچی کو چور نگاہوں سے دیکھتا رہا تھا، اور وہ اُسکی طرف ذرا بھی ملتفت نہ ہوئی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا۔ کہ جیسے اُسکے جہاز کا گودی میں لنگر انداز ہونا بعید از قیاس ہے۔ اُس کا جہاز تو بے ساحل ہو کر ہمیشہ زخار سمندروں میں بھٹکتا رہنے والا تھا۔ اُس کا وہ دورِ زہل، جس کی ابتداء لاہور کی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہوئی تھی، کبھی ختم نہ ہونے والا تھا۔

اب اُسے اِسکی ٹوہ لگ گئی تھی۔ کہ سوداگر بچی، جس سے وہ پہلے ہی ملاقی ہو چکا تھا۔ آخر کیا شے ہے۔ اُسے یہ یقین ہو گیا تھا، کہ وہ جو ایک بگڑ[5] اور پیکڑ[6] کے ساتھ گھومتی پھر رہی ہے، اُس کا تعلق کسی نچلے طبقے سے ہو گا۔ اور یہ

[1] میلنا : ڈالنا۔
[2] روج : رونا
[3] رفث : عورت کے ساتھ وقت جماع بات چیت کرنا۔
[4] لغاء : زنا — نقلِ شیریں : بوسۂ ہونٹ۔
[5] بگڑ : بگڑا ہوا۔
[6] پیکڑ : شرابی۔

سخت بے راہ و بے جمیت ہو گی۔ پر یہ اگر پری تھی تو اسکے ساتھ والا بھی تو پری زاد تھا۔

جس وقت یہ لڑکا اور عقمہ ڈفرن پل سے اُتر کر ایک بند شکرم میں سوار ہوئے تو میرا جی نے ایک تانگہ کر کے شکرم کا پیچھا کیا۔

باب نمبر ۵

دہلی جاری ہے

شکرم اُس رج کے پاس سے گزرتی ہوئی جہاں ۱۸۵۷ء میں انگریزوں اور بلوائیوں میں جنگ ہوئی تھی، ایک بنگلہ کے پاس رُکی، اور شکرم کے دونوں پسنجر پھاٹک سے اندر لان میں داخل ہو گئے۔

(۱۹)

میرا جی نے بھی تانگہ چھوڑ دیا تھا۔ اور اس نے رج پر چڑھنے کے بعد بنگلہ کے پھاٹک پر نظریں جمالی تھیں تاکہ یہ معلوم کر سکے کہ عصمہ کب کوٹھی سے باہر آتی ہے۔ وہ رج پر ایک رُوکھڑے[1] سے چھپلتی چادر میں بیٹھا ہوا تھا۔ اُسے پیاس بھی لگ رہی تھی اور گرمی بھی، مگر وہ وہاں سے نہ ٹلا، یہاں تک کہ شام ہو گئی۔ اس تمام وقت اُسکے کان دمود دیال کی عصمہ پر ماری سنتے رہے تھے، اور آنکھوں کے سامنے یہ منظر تھا کہ ایک ہندو لڑکا ایک مسلمان لڑکی کو مٹھیاں دے دے کر گوندھ رہا ہے۔

پھر میرا جی نے دیکھا کہ عصمہ بنگلہ سے باہر آرہی ہے۔ یہ رج سے اُتر کر اُسکے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ وہ پہلے سواری میں، پھر کوچے، سڑکیں پیدل عبور

---

[1] رُوکھڑا: چھوٹا سا پیڑ۔

کرتی ہوئی گلی قاسم جان پہنچی۔ اور ایک گنڈیریوں کے خوانچے والے کے پاس پہنچ کر بطور بیٹی سلام کیا۔ وہیں دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے، جن سے وہ جاتے ہی بے تکلفانہ ہم کلام ہو گئی۔ اب میراجی آسانی سے جان گیا کہ یہ عقمہ کے بھائی ہیں۔ لڑکے باپ پر تھے اور بد شکل۔ باپ اور بیٹوں کا لباس گھٹیا اور ملین تھا۔ لڑکے پونڈے چھیل رہے تھے اور باپ گنڈیریاں کاٹ رہا تھا۔ اس خوانچے والے کے پیچھے لگے ہوئے سے کواڑوں پر ٹاٹ کا بوسیدہ پردہ پڑا ہوا تھا۔

لڑکی نے باپ کو کچھ روپے اس طرح سے دیے جیسے وہ اُنہیں کما کر لائی ہو۔ یہ دیکھ کر دونوں بھائی بھی چلائے: "ہمیں بھی ہمیں بھی"۔ یہ آوازیں سُن کر پردہ کے پیچھے سے کچھ چینگا لوٹی سے بچے بھی باہر نکل آئے۔ عقمہ نے انہیں بھی کچھ کچھ دیا۔ حالات صاف بتا رہے تھے کہ روپیوں کی ریل پیل کا کارن یہ تھا کہ مُنیّہ سوداگر بچیّ رج (پہاڑی) کے پاس والے بنگلہ سے اپنا پٹاخہ چھُڑوا کر آئی ہے۔ اور یہ اُسی کا میلہ تھا۔

اب میراجی کو اپنی جمنا کا دھارا سوداگر بچیّ کی گنگا میں ڈالنے کا خیال زیادہ ہی آیا، لیکن ساتھ ہی ساتھ اُسے اپنی کنگالی؛ اور ہندو لڑکے کی پرتاپی[1] کے خیال بھی آئے، مگر اس سے ڈھارس سی بندھی کہ وہ عقمہ کو ریڈیو اسٹیشن پر کام یا ملازمت کے چکر دے کر کام نکال سکتا ہے، کیونکہ یہ لڑکی اُن آوارہ لڑکیوں کی طرح سے تھی جو فلم میں جانا چاہا کرتی ہیں، یا ریڈیو آرٹسٹ بننا۔

اب میراجی کو یہ پتہ چل تو گیا ہی تھا۔ کہ اس لڑکی کا فرضی باپ گنڈیریوں کا خوانچہ فروش ہے، اور عقمہ کو کنبہ کے لئے آذوقہ پہنچانے کی خاطر کسب کرنا پڑ رہا تھا، اس محنت میں سوار بھی تھا اور ریل پیل بھی۔ عقمہ کے لئے تو یہ

---

[1] پرتاپی: شان و شوکت

ایسا تھا کہ جیسے اُسکے کہنے میں ترصیح[1] ہو رہی ہے۔

ٹیلے والے واقعہ کے بعد عقمہ میرا جی کے پاس نہ آئی۔ اب وہ عجیب ہلگت[2] میں پڑ گیا تھا۔ اُسے عقمہ کے نام کی سیٹیاں بجانے کی عادت ہوئی جا رہی تھی۔ وہ ہر وقت یہی سوچتا رہتا تھا کہ کس طرح سے اپنی جمنا کا دھارا عقمہ کی گنگا میں ڈالے۔ اُس کے خیال میں وہ اب تار کھینچے لوگ[3] ہو گئی تھی۔ میرا جی عادتاً شکور[4] و صبور[5] تھا، اور نرکھوٹ[6] بھی، لیکن وہ اب اس صباح[7] لڑکی کے ساتھ شیشہ[8] گری کرنا چاہ رہا تھا۔ اُسے یہ تو عکاشفہ ہو ہی گیا تھا کہ عقمہ ہری چگ[9] ہے۔ اور ایک قسم کی کسبی، تو یہ اُس لڑکی کے لئے مکحل[10] بن سکتی تھی اور یہ اُس کے لئے مکحل[11]۔ میرا جی اس وقت گلِ نشاط[12] میں بھی مخمور تھا۔ اسکی طبیعت

---

[1] ترصیح : زیور میں جواہر جڑنا۔

[2] ہلگ : عادت

[3] تار کھینچے لوگ : Ductile. Easily to be bent.
یعنی جھکانے کے قابل۔ آسانی سے قبضہ میں آجانے والا۔ Flexible.

[4] شکور : شکر کرنے والا۔

[5] صبور : صبر کرنے والا۔

[6] نرکھوٹ : کھرا

[7] صباح : گورا رنگ مثل صبح

[8] شیشہ گری : دھوکہ۔ فریب

[9] ہری چگ : ہرجائی

[10] مُکحل : سُرمہ دانی۔

[11] مِکحل : سرمہ ڈالنے کی سلائی

[12] گلِ نشاط : شراب

چاہ رہی تھی کہ عقمہ اُسے چھکا دے کہ اِسکی طبیعت مچوانے[1] لگے مگر باوجود ایں اس کا پارا تاحال چڑھا ہوا ہو۔ اور وہ میراجی کو اپنی طرف رغبت دلانے کے لئے، بغل گیریاں کرتے ہوئے گائے ؎

ہماری کہی مانو راجہ جی
او راجہ جی
پورب نہ جائیو، پچھم نہ جائیو
ہمارے من میں رہیو، راجہ جی
ہو راجہ جی
ہمارے سنگ رہیو، راجہ جی
ہو راجہ جی

اور عقمہ کو میراجی کی اتنی چاہ ہو جائے کہ اسکا قدم قاسم جان کی گلی میں ٹھیرنے کی بجائے وہ اِسکے لئے یوں قربان ہوتی پھرے ؎

تیرے عشق نے نچایا تھیّا تھیّا[2]

عقمہ میراجی کے پاس اس لئے آئی تھی کہ یہ اُسے ریڈیو اسٹیشن پر کوئی اسامی یا کم از کم پروگرام دلوائے۔ گو ریڈیو اسٹیشن پر مسوّدہ نویس میراجی کا کافی احترام تھا۔ مگر آسامی یا پروگرام دِلوانا اس کے بس کی بات نہیں تھی، پر ایسا ہو سکتا تھا اور ایسا ہونا بھی چاہیئے تھا کہ عقمہ اور میراجی رشتۂ

---

[1] مچوانا: زیادہ کھانے پینے سے طبیعت نفرت کی حد تک پھر جائے۔
[2] تھیّا: (پنجابی) جگہ جگہ۔

ازدواج میں منسلک ہو جائیں۔ وہ اس سوداگر بچّی کو گندا پانی پھینوں[1] سے چھپا کر پلانا چاہتا تھا تاکہ اس چھپ چھپاؤ سے عقمہ کی جمعیتِ خاطر بنی رہے اور وہ پریشانیٔ خاطر کا شکار نہ ہو۔ مگر یہ نفوز[2] کی بات تھی۔

جب ایک دن جیٹھ ختم ہو کر دہلی کے آسمان پر اساڑھ کے ٹکڑے سے بادل آئے ہوئے تھے، عقمہ میراجی کے پاس ہر ہفت[3] میں پہنچی۔ اس نے ڈورئیے کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس کے گریبان پر نیلی چمک لگی ہوئی تھی، اور بٹن گھنڈیوں دار تھے۔ سب سے اوپر کی گھنڈی کھلی ہوئی تھی تاکہ اُسکا گلا خوب نظر آ سکے۔ اُسکا اوڑھنا سبز تھا۔ اور ٹانگوں میں لٹھے کی براق شلوار۔ اُسکے ہاتھوں میں نگ کی (کانچ کی) سیاہ چوڑیاں۔ اُس نے چہرہ پر گلگونہ ملا ہوا تھا۔ اور ہاتھوں پر رچی مہندی لگائی ہوئی تھی۔

۲۱

آج اُس کے تیور اتنے مُنک فریب تھے کہ اس پر نگاہ نہیں ٹھہر رہی تھی، اور جب اُس نے میراجی کو آداب کہا، تو میراجی میں جواب دینے کی سکت باقی نہیں رہی تھی۔ وہ تو کیف وکم[4] سوچے بغیر دوڑ کر اسکے لئے رخسار د

---

[1] پھین: کف سمندر۔ بلبلہ

[2] نفوز: بدی۔

[3] ہر ہفت: عورت کے سات سنگھار۔ ۱۔ مہندی۔ ۲۔ سُرمہ ۳۔ مسی۔ ۴۔ پان ۵۔ بنائے ہوئے بال، ۶۔ جوڑا۔ ۷۔ گہنا۔

[4] کیف وکم: کیسے اور کس قدر

چومتے ہی اُس میں نگینہ بٹھانا چاہ رہا تھا۔ عقمہ میراجی کا کساد[1] اور بیاکلی[2] دیکھ کر بولی: "خیر تو ہے؟"

میراجی : خیر کہاں۔

عقمہ : کیوں؟

میراجی : مجھے کابوس[3] کی بیماری ہو گئی ہے۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ جو گل ہے، وہ کسی کے ہاتھوں پر کھل رہا تھا۔ اور میں اُسے اُس ٹیلے پر کھڑا ہوا دیکھ رہا ہوں۔ جہاں ۱۸۵۷ء کے باغیوں نے انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھائی تھی۔

یہ سن کر عقمہ کا ماتھا ٹھنکا، اور وہ ذرا زِشت رُدئی سے کہنے لگی! "آپ کو تو مالی خولیا ہو گیا ہے۔

میراجی : پھر میں نے خواب میں دیکھا کہ جیسے میں گلی قاسم جان میں گنڈیریاں خرید رہا ہوں۔

عقمہ : اب ہم آپ کے پاس کبھی نہیں آئیں گے۔

میراجی : اور ہم آپ کو یہاں سے کبھی نہیں جانے دیں گے۔

پر ایک طرح سے جانے کی اجازت مل جائے گی۔

عقمہ : خیر بتا دیجیے کہ اجازت کیسے مل سکتی ہے۔

میراجی : اگر تم نے اقلف کے معنی بتا دئے، تو، میں تمہیں نہیں روکوں گا۔

عقمہ : میں نے عربی فارسی نہیں پڑھی۔ صرف اُردو داں ہوں۔

---

[1] کساد : بے رونقی۔

[2] بیاکلی : بے چینی

[3] کابوس :

میراجی : اقلف اُسے کہتے ہیں۔ جس نے سنتیں نہ کرائی ہوں۔

عقمہ : یہ بے محل کی تُک کیوں؟

میراجی : اس لئے کہ مسلمان لڑکی کا غیر مختون سے پٹنا مباح نہیں۔

عقمہ : کیا یہودی مختون نہیں ہوتے۔

میراجی : تم بڑی حاضر جواب ہو۔ لیکن اگر بہن بھائی ہیں مچاچچ[1] ہونے لگے، تو انہیں سٹر پھنگی ہی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے تمہارے ہی پڑوسی ہندو طبلہ نواز سے سب حالات معلوم ہو گئے ہیں۔ جو ریڈیو اسٹیشن پر ملازم ہے۔ لیکن میں پھر بھی تمہیں اپنی ازدواجی تحویل میں لانا چاہتا ہوں۔

عقمہ : لیکن تمہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ عقمہ اور اقلت بانی[2] میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں، اور میراجی بہت دُور۔

میراجی : آواز میں نزدیکی سہی مگر معنوں میں تو بہت دُور ہے۔ عقمہ بہت گوری چٹی کو کہتے ہیں اور اقلت تو غیر مختون ہے ہی۔ میں بھی مسلمان، تم بھی مسلمان اور وہ ہندو ہے۔

عقمہ : جاؤ جاؤ۔ بنت مُسلم کسی نے کہیں نہیں کہا، سب بُتِ کافر ہی کہتے ہیں۔

اب میراجی نے عقمہ کے دونوں ہونٹ، علیحدہ علیحدہ اور ساتھ ساتھ، نیز دونوں گال، ٹھوڑی، گلا اور چھاتیاں تک چھُوئے کر ڈالے، وہ

---

[1] مچاچچ : خوب ٹھوک ٹھوک کر بھرنا۔

[2] بانی : آواز

ذرا بھی مزاحم نہ ہوئی، اور ذرا دیر بعد کہا: "بس بس شریکِ حیات بنانے کے لئے کچھ اصول اور قواعد ہیں۔ دانا اُنگی پیر دی کرتے ہیں، سودائی نہیں کرتے۔ آپ اپنی مانگ میرے والد صاحب کے پاس جا کر پیش کریں۔"

میرا جی: اگر اُنھوں نے یہ مانگ نامنظور کر دی؟

عقمہ: وہ ایسا نہیں کریں گے۔ ہمارے یہاں کا دستور ہے کہ رشتہ مانگا جائے تو ساتھ ایک سو ایک روپیہ بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ اور یہ میز پر کیا دھرا ہے۔ چاندی کی گیند؟ ۔ کیا میں اسے دیکھ سکتی ہوں؟

میرا جی: (گیند میز سے اُٹھا کر اپنے قبضہ میں کرتے ہوئے) نہیں نہیں۔

عقمہ: ڈرئیے نہیں۔ میں اِسے لینا نہیں چاہتی، صرف دیکھنا چاہتی ہوں۔

میرا جی: نہیں دیکھ سکتیں۔

عقمہ نے سعید پنے چڑھی گیند کو کھول کر دیکھا تو اُس میں بھنگ تھی۔ جسے میرا جی پیا کرتا تھا، اور بھنگ پی کر اُسکے گھومتے ہوئے سر میں خیال آیا کرتے تھے کہ جیسے وہ اور عقمہ کسی آموں کے باغ میں ہوں، ساون کے پڑتے پانیوں میں پھلوں کا چوا[1] پڑ رہا ہے۔ وہیں ایک ہوادار بارہ دری میں کبھی عقمہ میرا جی کی معرب[2] بنی ہوئی ہو، اور کبھی میرا جی عقمہ کا معرب۔ میرا جی کے گیند چھینا چاہی تو وہ اور عقمہ دونوں گھل[3] رہے تھے۔ کبھی عقمہ نیچے تھی، میرا جی اوپر، کبھی عقمہ اوپر تھی، میرا جی نیچے۔ یعنی اُن دونوں میں

---

[1] چوا: پھلوں کا پک کر بے تحاشہ گرنا۔

[2] معرب: ماترا، زبر زیر لگانے کا فعل۔

[3] گھل: (پنجابی) کشتی کر رہے تھے

گویا طبق زنی[1] سی ہو رہی تھی۔ اور ان دونوں کے مستقر ایک دوسرے سے مل رہے تھے۔ اس گیر و دار میں میراجی نے عقمہ کے ممّوں[2] پر بھی ہاتھ پہنچائے تھے، اور انہیں پلپلا کر ڈالا تھا۔ گویا اس لڑکی کے مشتہیات[3] میراجی کی دسترس میں تھے۔

عقمہ کہہ رہی تھی اب کے آئی تو آپ کے منہ کے لئے کمام[4] بنوا کر ساتھ لایا کروں گی۔

اصل میں اس وقت یہ سوداگر بچی مادہ سے مفاوضہ[5] کرنے والی بن رہی ہوئی تھی۔ اس گھُلا ملی میں عقمہ کا پلڑا بھاری اور جھکا ہوا تھا۔ کیونکہ یہ لڑکی کھیلی کھائی ہوئی تھی۔

میراجی مضرور[6] و مضروب[7] و زیر بار دکھائی دے رہا تھا، اور اسکی یہ حالت قطعی ساختہ تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ کہ عقمہ ضرور ایک ماہر سفر باز[8] ہے۔ وہ پوری طرح سے مادجلہ[9] میں آئی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ دونوں ایک دوسرے

---

[1] طبق زنی: عورتوں کا آپس میں چپٹی کھیلنا۔

[2] ممّہ: (فارسی) پستان

[3] مشتہیات: وہ کہ جن کی کسی کو اشتہا ہو۔

[4] کمام: (فارسی) مویشی کے منہ کا چھینکا کہ وہ کچھ نہ کھا سکے۔ مسکا۔

[5] مفاوضہ: ہم بستری۔

[6] مضرور: جسے ضرر پہنچایا گیا ہو۔

[7] مضروب: جس پر ضربیں لگائی گئی ہوں۔ مار پڑی ہو۔

[8] سفر باز: وہ عورت جو چمڑے وغیرہ کے آلہ سے خود مسرور ہو اور دوسری عورتوں کو بھی مسرور کرے۔

[9] مادجلہ: عورت کو مرد کی خواہش۔

کی مسکامسکی کر رہے تھے۔ دصفہ متقابل پر جاری تھا۔
پھر وہ دونوں بے ستر ہو گئے۔ مجامعت کلی میں اُنیس بیس کا فرق رہ گیا تھا۔ کنجی تالے میں لگنے ہی والی تھی۔ بھینچا بھینچی کا دور آنے والا تھا۔ زمین پھٹ کر اُس سے شعلے بلند ہونے ہی والے تھے۔ آسمان اور زمین کا میل ہونے والا تھا۔ سُنار کی کھٹ کھٹ کے بعد ہتھوڑا بجنے والا تھا۔
اِس مطایبہ[1] میں عقمہ کا جسم ردیہلی گیند پر آگیا، تو وہ پھٹ گئی۔ اُس میں سے ایسا مواد نکلا کہ جسے لڈو بنا لیا گیا۔ یہ بھنگ تھا۔
اِسے دیکھتے ہی عقمہ نے طبق زنی بند کردی، حالانکہ میراجی چاہ رہا تھا کہ یہ تفرّح[2] وتعیش[3] وافتراح[4] دیر تک قائم رہے۔ کبھی یہ عقمہ پر تغلّب[5] حاصل کرتا رہے اور کبھی عقمہ اس پر۔ کبھی کُنجی قُفل پر لگے، تو کبھی قُفل کُنجی پر۔
اس پری پیکر کے معاملہ میں اسکی حالت نسیاً منسیاً[6] تک پہنچ گئی تھی۔ وہ فی الحال حُسنِ بنگالہ کو اپنے ہر دے سے محو کر چکا تھا۔ اُس کے دمِ سرد میں غضب کی گرمی آگئی تھی۔ اگر اِس وقت میراجی کا سامنا میرا سین سے ہوتا، تو وہ اُسے مُرتد گردانتی۔ وہ عشق کی دارالعدالت میں پیش ہوتا۔ تو جو مرتد کی سزا ہوتی ہے، وہ اُس کا مستحق قرار پاکر دار پر چڑھا دیا جاتا، تاکہ دوسرے ایسے ہی خیرہ سروں کے لئے باعثِ تنبیہ ہو۔

---

[1] مطایبہ : خوشبوؤں کے کھیل۔
[2] تفرّح : خوشی۔
[3] تعیش : عیش   [4] افتراح : فرحت
[5] تغلّب : غلبہ حاصل کرنا۔
[6] نسیاً منسیاً : پوری فراموش کاری۔

(۲۲)

افسوس یہ خیز دستیز[1] بلا کا مکاج کے جلا ہیں ختم ہو گیا تھا، حالانکہ میراجی چاہ رہا تھا کہ عقمہ اُس پر اِسی طرح سے دارائی حاصل کرتی رہے۔ اور یہ اُس پر۔ نہ یہ سلسلہ علم الحساب، علے الاطلاق[2]، علی الدوام چلتا رہے۔ عقمہ کو بھنگ کا گولہ دیکھ کر کراہت پیدا ہو گئی تھی۔ میراجی کی منہ کی بھانپ نے، جس میں شراب کی بدبو تھی۔ اُسے پہلے ہی نک چڑھی بنایا ہوا تھا۔ وہ اب سوچ رہی تھی کہ ایک بیکڑ اور بھنگڑ سے مُلوث و ممزوج[3] ہونے میں کچھ زیادہ منفعت نہیں ہو سکتی۔ اور اتنا عرصہ گذار نے کے بعد بھی وہ اِسے کوئی آسامی یا پروگرام نہیں دلا سکا تھا۔

جب عقمہ بدا ہونے لگی، تو میراجی نے کہا: دُشٹ اِستری[4] جی پھر کب آنا ہو گا؟

عقمہ: یہ کیا نام ہے۔؟ آپ نے تو اپنا نام میراجی کی جگہ میری نسبت سے رکھنے کا وعدہ کیا تھا۔

میراجی: میں اس پریتن[5] میں سپھل[6] نہیں ہو سکا۔

عقمہ: یہ کیا بولی ہے؟

میراجی: میں آجکل ہندی بولنے کی ابھیاس[7] کر رہا ہوں۔

---

[1] خیز دستیز: پیار محبت۔ [2] علے لاطلاق: بلے روک ٹوک۔
[3] ممزوج: ملایا ہوا۔ [4] دشٹ استری: بد عورت
[5] پریتن: کوشش [6] سپھل: کامیاب
[7] بھیاس کرنا: مشق کرنا

عقیمہ: آپ مجھ سے ادھک[1] آنندتا[2] کیا پائے، آپ تو بالکل عقر[3] اور ٹھنڈے ہیں۔ آپ کو دیکھ کر تو مجھے تہوع[4] کی شکایت پیدا ہو جاتی ہے۔ جیسے چوں کی توں ہے۔ تم اس میں تھوڑا سا انتشار بھی پیدا نہ کر سکے۔ حالانکہ ایسے میں تو یوں ہوا کرتا ہے کہ ؎

سبزے کو جائیں روند   اور پھولوں کو جائیں پھاند

اب یہ آپکی مخطوبہ[5] نہیں رہتا

میں کناس[6] سے شادی کر لوں گی

مگر عیاذ باللہ[7] علیہ العنت[8]

بھنگی[9] اور سابورہ[10] سے نہیں

آپ کے پاس نہ جلاوت[11] ہے نہ

توقر[12]، نہ چوبک[13] زنی کے

---

[1] ادھک: زیادہ۔

[2] آنندتا: مزا۔

[3] عقر: بانجھ

[4] تہوع: اُبکائی آنا۔

[5] مخطوبہ: منگیتر لڑکی [6] کناس: چوڑھا

[7] عیاذُ باللہ: خدا کی پناہ۔

[8] علیہ العنت: جس پر لعنت ہو۔

[9] بھنگی: بھنگ پینے والا۔

[10] سابُورہ: ہیجڑا۔

[11] جلاوت: تیزی طراری

[12] توقر: توقیر عزت [13] چوبک: ڈھول بجاتے کا ڈنڈا۔

لئے چوکھا چوبک، اگر ہے
تو صرف جوگ[1] اور ضراعت[2]

غضب ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے کھینچ کھینچ کر سازگاڈ[3] لگا رہی تھی
اور مخاطب انہیں تیبا[4] سمجھ رہا تھا۔

وہ میراجی کی بد بیان کر کے اس طرح سے گئی جیسے بلیات سے چھٹکارا پا کر جا رہی ہو۔ اور وہ تہیگاہ[5] میں بیٹھا ہوا سوچتا رہ گیا تھا کہ اُسے فی الحال اسکے ساتھ ضراب[6] کے ٹھیک ہونے میں بس ایک سوت کا بُعد رہ گیا تھا۔ اب اِسے کم ہمتی، بل ہینی[7] یا کیا کہا جائے۔؟ کہ اوکھلی میں دھان پڑے ہوئے تھے۔ مگر وہ پادھنگ[8] نہ چلا سکا۔ سوداگر بچی تو نہ دُھڑ دُھڑی لے رہی تھی، نہ الف ہو رہی تھی۔ لیکن یہ پھر بھی پڑی نہ جا سکا۔ اور اسی لئے وہ میراجی کو کذادکذی[9] کا نشانہ بھی بنا سکی تھی۔

میراجی تو یہ پڑھتا رہ گیا تھا ؎

لے گیا جان میری روٹھ کے جانا تیرا
ایسے آنے سے تو بہتر تھا نہ آنا تیرا

یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ میراجی نہ سفیہ[10] تھا، نہ ہُڑ دنگا۔

---

[1] جوگ: جوگی پنا
[2] ضراعت: عاجزی
[3] سازگاڈ: چمڑے کا کوڑا۔
[4] تیبہ: نازِ معشوقانہ
[5] تہیگاہ: خالی جگہ
[6] ضراب: مادہ کا نر سے جفتی کھانا
[7] بل ہینی: بے طاقتی
[8] پادھنگ: موسل۔
[9] کذادکذی: گالیاں
[10] سفیہ: بیہودہ۔

عقمہ سے آخری ملاقات کے بعد، میراجی نے اس کے باپ گنڈیری والا کے پاس ایک سوایک روپے بھیج دئے۔ اور ساتھ کے ساتھ اپنی مانگ بھی۔ عقمہ کے باپ نے روپیہ لانے والے کو کچھ بھی نہ دیا، بلکہ شکایت کی کہ لڑکی کا جوڑا اور کچھ زیور کیوں نہ روپے کے ساتھ آئے۔ روپیہ قبول کرنے کا مطلب یہ تھا کہ مانگ منظور ہو گئی ہے

گو بھنگ کے گوپے والی مل دل سے قبل میراجی کا ارادہ عقمہ سے کید[1] و گرگ آشتی[2] و شیشہ گری[3] کا تھا، لیکن وہ اس کے جاتے ہی شکستہ رنگ[4] ہو گیا تھا۔ اُس کے منہ سے بار بار یہ الفاظ نکل رہے تھے: "ہائے عقمہ! تو مجھے شقیقہ[5] دے کر چلی گئی" وہ خود کو بے در مطعون[6] و مطروح[7] سمجھ رہا تھا۔

---

[1] کید : دھوکہ۔

[2] گرگ آشتی : دھوکہ کی دوستی۔

[3] شیشہ گری : دھوکہ۔

[4] شکستہ رنگ : پژمردہ۔

[5] شقیقہ : آدھے سر کا درد جسے آدھا سیسی بھی کہتے ہیں۔

[6] مطعون : طعنہ زدہ

[7] مطروح : نکالا ہوا۔ دُر دُر کیا ہوا۔

میرا جی نے کچھ اپنے پاس سے اور کچھ قرضہ سے عقمہ کے لئے زیور اور جوڑا تیار کرا کر عقمہ کے گھر پہنچائے، مگر وہ اب اس کے پاس قطعی نہیں آ رہی تھی۔ میرا جی کا حال یہ ہو رہا تھا کہ دن کے وقت تو گلی قاسم جان کے چکر لگانے میں قباحت تھی، لیکن وہ ایسے شب کوکوئی[1] کی طرح سے جو رات کو کوکیں نہ ماریں، گلی قاسم جان میں پھیریاں لگاتا پھرنے لگا۔

پھر اس کے دل میں کچھ شبہات پیدا ہونے لگے۔ "کیا وہ اب بھی برج والے بنگلہ میں ہندو لڑکے سے ملنے جاتی ہو گی۔؟"

اب میرا جی برج کی چوٹی پر جا جا کر بیٹھنے لگا۔ ایک ہفتہ تک تو اس کی دیکھ بھال بیکار رہی۔ کیونکہ نہ تو وہاں وہ ہندو لڑکا نظر آتا تھا نہ عقمہ ایک شام اس نے دیکھا کہ ہندو لڑکا اور عقمہ کار سے اُتر رہے ہیں" اور سامانِ سفر بھی کار سے اُتارا جا رہا ہے۔

---

[1] شب کوک : وہ فقیر جو رات کو کوکیں مارے۔

باب نمبر ۶

دہلی (جاری ہے)

اس سے میراجی نے اندازہ لگایا کہ راج ہنس اور راج ہنسی کسی لمبی اڑان سے واپس آئے ہیں۔ وہ برج پر کئی گھنٹے اکیلا بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ چمگادڑیں گوشت منڈلیاں بنا کر پھلوں کے باغوں کی سمت اُڑنے لگیں۔

وہ سوچ رہا تھا کہ عظمیٰ کا سار[1] تو ہندو لڑکے نے پوری طرح سے کھینچ ہی لیا، اور اُسے صرف گوشتِ خر[2] یا اُلٹا پُلٹا مال ہی ملے گا۔ وہ چُل ہائی[4] تو گوش تا گوش[3] رقیب کے تحت رہ چکی تھی۔ اِس وقت اُسے میرا سین بہت یاد آئی۔ اُس کا دِل اُس حسنِ بنگالہ کے شفاف چلن اور خوش شعاری کی توصیف کر رہا تھا۔ وہ خوش تھا کہ وہ اس وقت تک میراجی ہی کہلا رہا ہے اور اچھا ہوا کہ اس نے عظمیٰ کی نسبت سے نام بدلی نہیں کی۔ جیسی اُس کی ماں

---

[1] سار: ست۔ رس

[2] گوشتِ خر: خراب گوشت۔ خراب چیز۔

[3] گوش تا گوش: سر سے پاؤں تک۔ کُل

[4] چُل ہائے: ہوسناک عورت۔

کُلٹا[1] ہے، ایسی ہی یہ ہے ۔ اگر یہ لڑکی سرنا تھی تو اُسکا دوست اِس کا سرناچی
وُہ اپنی جائے قیام پہنچا ، تو اسکی طبیعت مرجھائی ہوئی تھی ۔ اُس کے
احساسات اُس گڈریے جیسے تھے جس کے ریوڑ کی تمام بھیڑ بکریاں ہُنڈال[2]
اُٹھالے گئے ہوں ۔ اُس نے رات کا کھانا بھی نہ کھایا ۔ یوں ہی آدھی رات
ہوگئی ۔ پھر اُسے بھنگ کا لڈّو لوٹنا یاد آیا ۔ اُس نے اپنی اُس چارپائی پر
نگاہ جمائی ۔ جہاں عفمہ نے اُس کے ساتھ حرکاتِ سقر[3] بازی کی تھیں ۔ وہ جو اُس
کا دل عفمہ سے ہٹ گیا تھا ، اُسکی دوبارہ یہی حالت ہوگئی کہ ؎

پھر اُسی بے وفا پہ مرتے ہیں

وُہ گلی قاسم جان کو روانہ ہوگیا ، تاکہ گدائے شب کوک کی طرح سے
عفمہ کے پیار کی بھکشا[4] مانگے ۔ وہ اب بھی اُس تنگ چشم کا مخطوب[5] بنا ہُوا تھا ۔
اگلے دن اس نے پھر عفمہ سے شادی کی سلسلہ جنبانی کی ، لیکن وہاں سے
متواتر انکار ہونے لگا تھا ۔ اُسے تو عفمہ یہ تک کہتی ہوئی سنائی دے رہی تھی!
"مُوا شاعر بنا پھرتا ہے ۔ کہاں گیا وُہ تیرا میرا کا عشق ۔ عشق ٹھُس ٹھُس ۔ جبھی تو
اُس نے منہ نہ لگایا ۔ اِسکی شکل تو دیکھو ۔ داڑھی بڑھائے ، مُوا جوگی ۔ پورا جھرُدس"

---

[1] کلٹا : بدصحبت ، بدکار عورت ۔
[2] ہنڈال : بھیڑیا ۔
[3] سقر باڑی : عورت کی عورت سے مُباشرت ۔
[4] بھکشا : خیرات ۔
[5] مخطوب : منگیتر مرد ۔

اس پر اس نے مونچھوں اور داڑھی کے بال صاف کرا دیئے تھے۔
اب جب بھی اُسے ریڈیو اسٹیشن سے فرصت ملتی، تو وہ کمپنی باغ کی ہارڈنگ لائبریری میں پایا جاتا۔ یونہی کئی مہینے گزر گئے، اور دسہرا آگیا۔ لائبریری بند تھی، اس لئے وہ رام لیلا گراؤنڈ پہنچا۔ وہاں وہ کیا دیکھتا ہے کہ وہی ہندو لڑکا ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک دوسرا کمسن ہندو لڑکا بھی ہے، جس نے گلے میں ایسی جنیو نما کنٹھی پہنی ہوئی ہے، جس سے چھوٹے چھوٹے تونبے نما بھڑکیلے لعل لٹک رہے ہیں۔ لعل ہل ہل کر ایک دوسرے سے مل رہے ہیں۔
اس چھوٹے امرد کا ماتھا بیر بہوٹی نما قشقے سے مزین ہے۔ اُس نے گلاب کے ہم رنگ ٹسر کا کرتا پہنا ہوا تھا۔ جس میں سونے کی زنجیر والے بٹن قفل نما لگے ہوئے تھے۔ گلے کے پاس والا بٹن کھلا تھا۔ کرتے پر کچناری مرزئی تھی۔ کانوں میں اُس کے مردانہ گوشوارے تھے۔ سر پر رام پوری حامد کیپ جیسی ہریل طوطا ٹوپی، اور ٹانگوں میں سفید دھوتی تھی، جس نے اسکی پنڈلیوں کو پیچھے کی طرف سے برہنہ چھوڑا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے بال البرٹ فیشن میں کٹوائے ہوئے تھے۔ مادہ نر بنی ہوئی تھی۔ اُس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ممے بڑی ہی ترکیب سے چھپائے ہوئے تھے۔

یہ اصل میں اُسکی سابقہ منگیتر عقمہ تھی۔ اُفو! بہشت کے غلمان اس گیسو بریدہ گوسالہ[۱] ہستی سے زیادہ رُوپ ونت[۲] نہ ہونگے۔ لیکن اُسکے تیور دنگنی بچھیرے جیسے تھے۔ وہ اپنے دوست کے ساتھ چھوٹے چھوٹے

---

[۱] گوسالہ: بچھڑا۔

[۲] رُوپ ونت: حسین۔

قدموں سے چل رہی تھی۔ ہندو لڑکا رام بنا ہوا تھا۔ اور عقمہ رام کا چھوٹا بھائی۔ لکشمن میرا جی کے جی میں آ رہا تھا کہ پہلے یہ لکشمن بنی ہوئی عقمہ کی بغل میں ہاتھ ڈال کر گدگدیاں اُٹھائے اور جب وہ ہنسی سے بے تاب ہو رہی ہو تو سینے لپٹا کر اُس کے ہونٹ ماچ[1] بازی سے بند کر دے۔

پھر اُسے خیال آیا کہ لڑکا تو سفید اسپنی شراب کی ایسی ہی نہر ہے جیسی عقمہ، اور ان دونوں کے دھارے خبر نہیں کتنی بار ملتے رہے ہونگے۔

میرا جی کے پاس عقمہ کو حاصل کرنے کے لئے زر تو تھا ہی نہیں ایک زاری تھی، اور وہ بے اثر۔ وہ اُس سے بہلائی پھسلائی جا کر یا بزور اغوا نہیں کی جا سکتی تھی۔ وہ تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اور طفل ہندو سب کچھ کر رہا تھا۔ وہ تو اگر اب اُس کے ہاتھ بھی آجاتی تو گھگیر[2] تھی۔ اور طفلِ ہندو کے لئے اصیل گینی۔

میرا جی کے کانوں میں اب ہمیشہ اسی دنادنی کی آوازیں آتی رہتی تھیں جو دمودر رشی بھون میں عقمہ کے ساتھ روا رکھا کرتا تھا، جنہیں سن کر چھجے پہ بیٹھے ہوئے میرا جی کی جان سی نکل جایا کرتی تھی۔

۲۷

میرا جی نے رام لیلا کے میدان میں اپنی موجودگی دکھانے کے لئے عقمہ کا راستہ کاٹا، لیکن وہ صورت باز[3] تو ایسی اداسین[4]، چشم دریدہ[5] و تجبر[6] بنی

---

[1] ماچ: بوسہ۔ [2] گھگیر: دنگئی گھوڑا۔
[3] صورت باز: بہروپیا۔ [4] اداسین: بے پردا۔
[5] چشم دریدہ: بے حیا۔ [6] تجبر: پتھرن جانا

ہوئی تھی۔ کہ جیسے وہ اس گزرنے والے کو جانتی ہی نہ ہو۔ کیا اُسکا ہندو دوست رام تھا۔ اور یہ راون کا وہ پُتلا جسکے پھٹنے پر پبلک خوشی کے نعرے بلند کیا کرتی ہے۔

جب شام ڈوبنے لگی، تو میراجی برج پر جا بیٹھا، اور سورج چھپنے سے ذرا بعد ایک کار بنگلہ رشی بھون میں داخل ہوئی۔ جہاں عقمہ کا ہندو دوست رہتا تھا، اور یہیں لڑکا (لچھمن) بنی ہوئی اپنے دوست کے ساتھ کار سے اتر کر رشی بھون کے پورٹیکو میں داخل ہوگئی۔

میراجی نے تاریخ مرہٹہ میں پڑھا ہوا تھا کہ انتہائی مقتدر و عظیم پیشوا، باجی راؤ، جسکی سلطنت کا پھیلاؤ ملیوار[1] سے پنجاب تک پھیلا ہوا تھا، کی ایک مسلمان ڈھولن[2] مستانی تھی، جسے وہ ہر آن ساتھ رکھا کرتا تھا۔ باجی راؤ کو کوئی جنگی مہم پیش آئی، تو یہ دلبند معشوقہ اور عظیم پیشوا سنگرام بھومی[3] رکاب سے رکاب ملائے ہوئے رن چڑھا کرتے تھے۔ اسی پر کسی انگریزی کے شاعر نے ایک بیلڈ لکھا تھا، جس کا پہلا بند اسطرح سے ہے ؎

Strip to strip rode Mastani with the great Peshwa Balajee.

ترجمہ: مستانی عظیم پیشوا بالاجی کے ساتھ، رکاب سے رکاب ملائے جا رہی تھی۔

میراجی برج پر بیٹھے ہوئے آدھی رات تک بیلڈ کا یہی مطلع پڑھتا ہوا انتظار میں سوکھتا رہا تھا۔ کہ عقمہ کب رشی بھون سے نکل کر کب اپنے گھر

---

[1] ملیوار : مالابار۔

[2] ڈھولن : محبوبہ۔

[3] سنگرام بھومی : میدانِ جنگ۔

گلی قاسم جان جاتی ہے۔
پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ عصمت بنگلہ میں ہی شب بسر کر رہی ہے، تو وہ جامع مسجد ہوتا ہوا، چوراہے چتلی قبر سے بڑھ کر بو جلہ پہاڑی پہنچا جہاں صفیہ معینی رہتی تھی۔
میراجی بلا کسی سے پوچھے صفیہ معینی کا گھر تلاش کرتا پھرتا رہا تھا۔ وہ اپنا ہاتھ سینہ پر اس طرح سے آہستہ آہستہ مار رہا تھا۔ جس طرح سے کوئی شرمیلا محرّم کے ماتم کناں جلوس کے ساتھ چلتا ہوا اپنے سینہ پر آہستہ آہستہ ہاتھ مارا کرتا ہے۔
پھر وہ داہنے ہاتھ والا بازار سیتا رام کا راستہ چھوڑ کر ترکمان دروازہ پہنچ گیا۔ جب آدھی رات ہو گئی تو لال کنواں اور چاوڑی بازار پیچھے چھوڑتا ہوا گلی قاسم جان آگیا۔ یہاں اُس نے ہمدرد دواخانہ پر اس طرح سے ملتجیانہ نگاہیں ڈالیں جیسے وہ وہاں سے دوائے دردِ دل مانگ رہا ہو۔
جب وہ تھک تھکا کر اپنی جائے قیام جا رہا تھا تو ایک پولیس والے سے اُسکی مٹھ بھیڑ ہو گئی۔ جس نے اُسے آوارہ سمجھ کر سوال کیا: "کون ہے تو؟ اپنا نام اور پتہ بتا"
میراجی : میرا نام میراجی ہے۔
پولیس کا سپاہی : یہ کیا نام ہے۔ تو ہندو ہے یا مسلمان؟
میراجی : ماں باپ مسلمان تھے، بس کچھ بھی نہیں۔
پولیس کا سپاہی : اپنا اصل نام بتا، ورنہ تھانہ چل۔ تجھے حوالات میں بند کر دیا جائے گا۔

اس پر میراجی نے اپنا آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت کا کارڈ دکھا دیا، تو اسکی خلاصی ہو گئی، اور بعد میں اس نے اپنے ایک دوست کو یہ واقعہ تفصیلاً لکھا، اور ساتھ یہ بھی کہ مجھ جیسے بھنگڑ، شراب نوش اور سبہ کار کو "محمدؐ" رسول اللہ کا نام نہیں سجتا۔

اپنے جائے قیام پہنچ کر اس نے سونے کی کوشش کی، لیکن نہ سو سکا۔ اُس کی کھلی ہوئی آنکھیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ جیسے کوئی پھنپھناتا ہوا سانپ چھید میں بار بار گھس رہا ہو۔ اور باہر آرہا ہو۔ یہ ایسا ہو رہا تھا، کہ جیسے کوئی کسی گیت کی انت کا شبد[1] گا رہا ہے۔ اُسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کی محبوبہ عقمہ اور اِس کا رقیب لطفِ مخالطت[2] اُٹھاتے ہوئے اس پر شماتت آثار نگاہیں ڈال رہے ہوں اُسے عقمہ کے چہرہ پر اتنی املتا[3] تھی کہ اس سے اُسکی طرف دیکھا تک نہیں جا رہا تھا۔ اور یہ وہی تھی۔ جسکا یہ کبھی فوقانی[4] تحتانی بنا تھا، اور کبھی وہ اِسکی فوقانی و تحتانی بنی تھی۔ اب تو دمودر ہی سوداگر بچی پر دمادم کر رہا تھا۔ اور وہ خود دمودر کے لئے خرمست[5] بنی ہوئی تھی، اور دمودر اُس کے لئے خرمست۔

---

[1] انت کا شبد: گیت کا وہ بول جو بار بار دہرایا جائے۔ Refrain

[2] مخالطت: وقتِ جماع مرد عورت کا بوس و کنار اور پیار کی باہم گفتگو۔

[3] املتا: کڑواہٹ۔

[4] فوقانی: اوپر والا۔

[5] خرمست: بدمست۔

اب میرا جی نے پھر ڈبیہ والے دوست کو لاہور چھٹی لکھی کہ اس نے سوداگر بچی کی طرف اتنی (Advances) پیش قدمیاں کی تھیں کہ یہ اُس کا طبق زن بن گیا تھا۔ اور وہ اُسکی طبق زن مختومی[1] اور تلذّذ عُقدہ کشائی میں بس اتنا فرق رہ گیا جتنی ملی ہوئی دو انگلیوں کے درمیان ہلکے سے درز کی خلا ہوتی ہے۔ اِسکا خیال تھا کہ وُہ اسکا سر زور زور سے متواتر پھبکیں مار مار کر ہمیشہ نیچا کرتا رہے گا۔ لیکن اِس نے اُسے ایک ہندو لڑکے کے ساتھ اُلٹا سیدھا پھاگ کھیلتے پایا، تو اِسے میرا سین اور بلا کر یاد آتی رہی۔

اُس نے آگے چل کر لکھا تھا: "میں نے تمہیں ایک دفعہ کہا تھا کہ ہر عورت سُرخ علاقے کی اُس عورت کی طرح ہے۔ جس کے پاس میں تمہیں اپنی ڈبیہ پکڑا کر جایا کرتا تھا۔ اُس سے میں ملوں، تم ملو، یا کوئی ملے، کچھ فرق نہیں۔ وہ میرا دعویٰ غلط تھا۔ میں تو یہ چاہتا ہوں جو میری بنے۔ اُسے کوئی اپنی نہ بنا سکے۔"

میں تمہیں نہایت کامیاب انسان سمجھتا ہوں۔ تمہاری بیوی بھی ہے، بچے بھی، اور فارغ البالی بھی۔ تم پوری چمک[2] میں ہو۔

میں نے اس زندگی میں تین قیمتی چیزیں حاصل کی ہیں۔ ایک میرا سین کی لگن، دوسرے اُسکی تصویر۔ تیسری مونگوں کی مالا جسے وُہ اپنے گلے میں پہنتی تھی۔ مجھے یہ تینوں جان سے زیادہ پیاری ہیں۔

یہاں دہلی میں بھی ایک رپ رپ[3] کرتی لڑکی میرے لوکم پوپ میں بس

---

[1] مختومی: مہر لگائے جانے کا فعل۔ مہر شدہ ہو جانا۔
[2] چمک: خوش وقتی۔
[3] رپ رپ کرنا: چمکنا

گئی تھی۔ میں معلنقے کرنے کے بعد اُسکے ٹھونگیں مارنے کو تیار ہو گیا تھا۔ وہ بھی تیار تھی مگر میرا بیل کنٹھ مُتعارہ زنی کی جگہ ہاری ہوئی فوج کے جھنڈے کی طرح سرنگوں ہو گیا تھا۔ ایسے میں نوبت مذاب تک پہنچ گئی تھی۔ اب اُس نے مرکھاہی[1] بن کر مجھے مکھلا[2] اور ملین[3] تک کہہ ڈالا تھا۔

میراجی کی موڑھتا دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔ عقمہ کی لالسا نے اِسے اپنے فرضہائے منصبی کی ادائیگی سے کچھ معرا سا کر دیا تھا، مگر ریڈ اسٹین پر اسکی حرمت بنی ہوئی تھی۔ اور ڈائریکٹر درگزر کرتا تھا۔ اور اُسکے ساتھ نرمی گرمی بھی نہیں برتی گئی تھی۔

اب اُسکا دل دہلی سے بیزار ہو گیا تھا۔ اُسکی طبیعت ایسی ہو گئی تھی کہ جیسے وہ کپڑے پھاڑ کر جنگلوں میں نکل جائے۔ وہ آگرہ چلا گیا اور بجائے تاج محل دیکھنے کے جوتوں کے بازار کی راہ لی۔ وہ شاعری اور ادب چھوڑ کر جُفت فروش بننا چاہ رہا تھا۔ اُس نے لاہور لکھا کہ اُس کے لئے اِس تجارت کے لئے کسی دکان کا انتظام کیا جائے۔ اگر وہ اِس سوداگری میں پڑتا تو تجارتی مقابلوں کے اندھیاروں میں اُسکی حالت ایسی ہوتی کہ جیسے کوئی کتاب کا کیڑا طوفان پر چڑھا جا رہا ہو۔

وہ دہلی لوٹ آیا۔ یہاں اسے ہوائیں تک بلاپ کرتی ہوئی معلوم

---

[1] مرکھاہا : مارنے والا

[2] مکھا : بے ہودہ۔

[3] ملین : میلا۔

ہونے لگیں۔ وہ جس طرف بھی نظر اٹھاتا، اُسے ایسا لگتا کہ جیسے عفمہ کا دوست اس لڑکی کو رشی بھون میں لاکر اُس سے رفث[1] بازی کر رہا ہو۔ اور یہ اُن دونوں کے سر پر انگارہ بنا ہوا گرز آہنی مار رہا ہے لیکن وہ ایسے جزوِ لا یتجزٰی[2] بنے ہوئے تھے کہ اُن کا اُلگاؤ[3] ناممکن تھا۔ اِس کی سمجھ کہہ رہی تھی کہ عفمہ کے آگے پر گرم رکابی[4] سے ایسے زخم آئے ہوئے ہیں۔ جیسے گھوڑے کی پیٹت پر کاٹھی کے بے جا کساؤ[5] سے گھاؤ کھل جاتے ہیں۔ گھوڑوں کے ایسے زخموں کو فارسی میں جزل کہا گیا ہے۔

اُسے اِسکا بھی افسوس ہو رہا تھا کہ اس نے ایک وقت کی کچھ نہ کچھ لکھیتی سے پوری پوری منفعت حاصل نہ کی۔ نہ بہ اس سے پورم پور لطفِ گفتار پا سکا۔ نہ لطفِ دید۔ اِسکی اور عفمہ کی تو ساعاتِ صُحب میں ایسی کیفیت ہو جانا چاہیئے تھی کہ ؎

مے پرستی کا مزا جب ہے کہ ساقی کہہ اُٹھے
مَے میں وہ مستی کہاں جو میرے دیوانے میں ہے

جب سوداگر بچی میراجی سے پوری اور قطعی مُجانبت[6] اختیار کر چکی، اور صفیہ مُعینی، سحاب قزلباش یا مسز حمید حسین کو میراجی کا خشخاش برابر بھی خیال نہیں تھا، اسلئے اُسے اپنے دل کی مرد رڑیاں کھولنے کے لئے محبّت

---

[1] رفث : عورت کے ہونٹھ چومنا اور چوسنا۔
[2] جزوِ لایتجزٰی : اتنا مُدغم ایک دوسرے سے جُدا نہ ہو سکیں۔
[3] اُلگاؤ : ایک دوسرے جُدا کرنا۔ [4] گرم رکابی : پکی سواری
[5] کساؤ : کسنے کا اسم۔
[6] مجانبت : دوری میں چلے جانا۔

کے نئے نئے آسمانوں کی تجسّس تھی، اور ایک نیا آسمان اُسے کماری یادو میں مل گیا تھا جو ایک نوشادی شدہ اہیرنی تھی، ہندو دیومالا سے دلچسپی کے سبب میراجی کو علم تھا کہ اہیر کنتر برنؔ[1] سری کرشن کی اولاد سے ہیں اور اہیروں کو عزت کی خاطر یادو پکارا جاتا ہے۔ سری کرشن کا ایک نام دوارکا ناتھ بھی تھا، کیونکہ سری کرشن دوارکا کے راجہ بھی تھے، اور میراجی کا ٹھیا واڑ میں بچپن گزار چکا تھا، یہیں دوارکا کی جائے وقوع تھی۔ اس نے یہ مشہور زمانہ بھجن بھی سُن رکھا تھا ؎

جمنا کے تیر وانو گیّاں چرا و نے آکھر جات اہیر

یہ بھجن سری کرشن کے جمنا کنارے گائیں چرانے کے متعلق ہے۔ سری کرشن کو تصویروں میں سبز رنگ دکھایا گیا ہے کیونکہ وہ کالے تھے۔ انہیں کالا چور بھی اِس لئے کہتے ہیں کہ طفلی کی معصوم عمر میں وہ مکھن چُرا کر کھا لیا کرتے تھے۔ اُردو میں ایسے معشوقوں کو سبز رنگ بھی کہا گیا ہے، اِسی لئے بھنگڑ نشہ میں یہ گیت گایا کرتے ہیں ؎

گاڑھی چھنے کی آج کسی سبز رنگ سے۔

میراجی کو خود بھی بھنگ پینے کا لٹکا تھا۔ نوشادی شدہ کماری دہلی ریڈیو اسٹیشن پر گانے کے پروگراموں میں حصّے لیا کرتی تھی۔ اور اسٹیشن پر یہ چرچے ہو رہے تھے کہ وہاں ایک ایسا معشوق آیا ہے کہ جس کے مقابل ساون کے دنوں گگنؔ[2] پر کھنچنے والی اِندر دھنشؔ[3] بھی کچھ نہیں۔

میراجی تو حُسن پر اُڑ کر پڑھنے والا تھا، اور اِس سمے اِسے مایوسیاں بھی

---

[1] کنتر برن : کالے بادل ایسے بدن والا۔

[2] گگن : آسماں۔

[3] اندر دھنش : قوسِ قزح۔

گھیرے ہوئے تھیں، اس لئے وہ اہیری پر سو جان سے عاشق ہو گیا۔

کُماری یادو کی رنگت پکّی ضرور تھی مگر اُس میں صفیہ مُعینی، سحاب قزلباش، مسز حمید حسین بلکہ عقمہ سے بھی زیادہ چم خم تھا، اور ویسے بھی یہ کہاوت ہے کہ ؎

کالے گورے پہ کچھ نہیں موقوف
دل کے آنے کے ڈھنگ نرالے ہیں

جب کماری یادو ریڈیو اسٹیشن آتی تو میرا جی کا ہردا اُسی کی طرف ہو جاتا تھا، اور وہ گاتی تو میرا جی کو اپنے کل فرائض چھوڑ دینے پڑتے تھے۔ ایک دن کماری یادو گا رہی تھی، اور میرا جی اُسے سُن رہا تھا، کہ اُسے ریڈیو ڈائریکٹر نے تین بُلاوے بھیجے، مگر اُسکی تو یہ حالت تھی کہ جیسے جون آف آرک آکاش وانی سُن رہی ہو۔ ڈائریکٹر خود اُس کے پاس آیا تو دیکھا کہ اُس کی تو تعلیم کے اُس دل دادہ طالب علم کی طرح تھی کہ جس کی انگلی شمع کی لو پر رکھ دی، پر طالب علم پھر بھی اپنے شغل میں غرق رہا۔ حالانکہ حُجرہ میں انگلی کے جلنے کی بُو پھیل رہی تھی۔

کماری یادو نے گانا بند کیا، تو میرا جی کے مُنہ سے اِس شعر کے گنگنانے کی آواز نکل رہی تھی؛

؎ می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دِگر
است از یک بند تا اُفتاد در بندے دِگر

(اقبال - پیامِ مشرق)

میرا جی ہوش میں آیا، تو اُس نے ڈائریکٹر کو دیکھ کر اُس کی آؤ بھگت

کی۔

میراجی کا یہ چھٹا عشق تھا۔ کیا پہلے بند سے اُسکی رُستگاری ہو چکی تھی؟ کیا سبز رنگ سفید رنگوں پر غالب آچکا تھا؟ کیا میرا سین اُسکے دل سے محو ہو چکی تھی؟ کیا وہ عقمہ کو بھول سکتا؟

جب سے عقمہ نے اُس سے مجانبت اختیار کی تھی، وہ چھوئی موئی کی طرح سے سوتا ہوا سا رہتا تھا۔ اُس کے حواس اُسے جواب دے رہے تھے۔ صرف کماری یادو کے آنے سے اُس میں جان سی پڑ گئی تھی۔ مگر اب اُس نے اپنی تمام صلاحیتیں کماری یادو پر مرتکز کر دی تھیں۔ اسکے دوستوں کو اُس سے ہمدردیاں ضرور تھیں، پر وہ کیا کر سکتے تھے۔

میراجی کا کام سرِ شام ختم ہو جاتا تھا، لیکن وہ کماری یادو کے لئے ریڈیو اسٹیشن میں ہی ڈٹا رہتا تھا۔ عملہ کو میراجی کی یہ ہلکٹ ناگوار تھی۔ ایک شب وہ بیٹھا بیٹھا سو گیا۔ چوکیدار نے اُسکی باہنہ پکڑی، اور گھسیٹتا ہوا باہر نکال رہا تھا۔ کہ کماری یادو اسکی مدد کو آئی، اور اُسے مزید تھپیڑوں سے بچالیا۔ میراجی کی تمنا تھی کہ وہ روز یوں ہی تھپڑایا جاتا رہے۔ اور کماری یادو اُسے آ آکر چھڑاتی رہے۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی میں میراجی کی یہ پہلی حقیری تھی۔

میراجی اِسکے بعد بھی اپنی ضد پر جما رہا۔ اب کماری یادو کو اُس کی مدد کے لئے آنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ چوکیدار اُسے پکڑ کر نکال دیا کرتا تھا۔

پھر کماری یادو ڈیڑھ ماہ تک ریڈیو اسٹیشن نہ آئی کیونکہ اُسکا شوہر بیمار تھا، اور اُسکے مرنے پر نوشادی شدہ لڑکی وِدھوا ہو گئی تھی۔ پھر اُسے ایک مہینہ اور غیر حاضر ہونا پڑا۔ کیونکہ وہ ایک بچہ کی ماں بن رہی تھی، اس لمبے عرصہ میں میراجی زیادہ ہی جھلّا ہو گیا تھا۔ دہلی میں اُسکی دل بستگی

پانچ لڑکیوں سے ہوئی تھی، لیکن اُس نے اپنے دل میں میرا سین سے زیادہ
کسی کو نہیں گھسنے دیا تھا۔

میراجی کو اسکی فانوس خیالی کے سبب ملازمت سے علیحدہ کرنے
کی گفتگو ہو رہی تھی۔ اگر اس میں دانائی ہوتی، تو وہ ملازمت میں رہ کر
فارغ البالی سے گذر کر سکتا تھا۔ ایسے دربدر اور آوارہ کو تو خاک نشینی
اور درماندگی ہی مل سکتی تھی۔

(۳۱)

میراجی کا کماری یادو سے عشق کوچہ و بازار میں نہ سہی ریڈیو اسٹیشن
پر کچھ کچھ مشہور ہو چکا تھا، مگر کماری یادو کو اِس رُست خیز کی کوئی خاص
خبر نہیں تھی۔ میراجی آگ میں جل رہا تھا۔ پر کماری یادو کو اس کی بُو نہیں
آرہی تھی۔

بیوہ ہو جانے اور چھلے کے بعد کماری یادو ریڈیو اسٹیشن باقاعدگی
سے آنے لگی تھی، اور میراجی دہلی سے اکتا کر بمبئی جانا چاہ رہا تھا۔

میراجی کے ایک دوست نے موسیقی کے انچارج سے جا کر سفارش
کی کہ میراجی بمبئی جا رہا ہے، اسکی ایک مرتبہ کماری یادو سے ملاقات کرادی
جائے۔ انچارج نے کماری یادو سے کہا: "ہمارے ایک ملازم، جسے
شائد نوکری سے جواب مل جائے۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ اور آپ
کا کرشان نامہ پوچھنا۔ کیونکہ کماری تو آپ کو آدر سے کہتے ہیں، اور یادو
اس لئے کہ آپ اہیرنی ہیں۔ کماری یادو: میں اسکی ملازمت کی ٹھیکہ دار
تو نہیں؟

انچارج: پر اُسے جواب آپ ہی کی وجہ سے مل رہا ہو گا۔ کماری یادو!

یہ چغلہ[1] ہے۔ یہی اسکی وجہ نہیں ہو سکتی۔
انچارج : آپ کو دیکھ کر اُسکی سُدھ بُدھ جاتی رہی ہے۔ اور وہ کام نہیں کر سکتا۔ جب آپ لمبی چھٹی پر گئیں، تو اس نے شیو کرانا چھوڑ دیا تھا اُسکے بال بکھرے بکھرے رہنے لگے تھے۔ میں نے اُسکا گریبان کھلا ہوا دیکھا، اور ایک پتلون پر دوسری پتلون پہنے ہوئے۔ وہ ممبئی چلا جائے گا۔ آپ اُس سے ایک بار مل لیں، اور اپنا کرسٹانی[2] نام بتا دیں۔ وہ مجھ سے نہیں ملا میں ایسا کیول[3] متر بھاؤ[4] سے کہہ رہی ہوں۔
کماری یادو : میں اس سے بات کوئی نہ کروں گی، البتہ اُسے میرا کرسٹانی نام معلوم ہو جائے گا۔
انچارج : بات نہ کریں، نام بتا دیں۔ تو پھر کب ؟
کماری یادو ! آپ اُسے کل میرے گھر لے آئیں۔ میں آپ کو دس بجے دن ڈرائنگ روم میں بیٹھی ہوئی ملوں گی۔
انچارج : تو میں اُسے اس نمتر[5] کی سبھ سُوچنا[6] سنا دوں۔
کماری یادو : آپ کو ادھیکار[7] ہے۔ پر وہ بھوت پریت بنا ہوا نہ آئے

---

[1] چغلہ : بہتان

[2] کرسٹانی نام : بجائے خاندانی نام کے اصل نام۔ مثلاً اندرا کرسٹانی نام ہے اور گاندھی خاندانی نام۔

[3] کیول : صرف

[4] متر بھاؤ : دوستانہ برتاؤ۔ Friendly feeling

[5] نمتر : بلادا

[6] سبھ سوچنا : خوش خبری

[7] ادھیکار : آزادی

کہ میں اس سے بھے[1] کھا جاؤں - اور بن سنور کر بھی نہ آئے -

انچارج : بن سنورنا تو اُسے آتا ہی نہیں - میراجی کو "سبھ سوچنا" ملی تو اُس نے شیو کرایا، لانڈری سے آئے ہوئے کپڑے پہنے، اور میوزک انچارج کے پاس پہنچا - پھر وہ دونوں نماشام[2] باڑا ہندو راؤ روانہ ہو گئے یہاں ایک گلی میں نمچی[3] کے پاس کماری یادو کا گھر تھا - کماری یادو ہارمونیم پر گا رہی تھی ؎

شغل گر چاہتے ہو دِل کے بہلنے کے لئے
دل میں آجاؤ کلیجہ میرا ملنے کے لئے

(داغ)

مہمانوں کے آنے پر گانا بند ہو گیا - کماری یادو نے دونوں مہمانوں کو صوفے پر بیٹھایا، اور آپ ان کے لئے شربت لینے چلی گئی -

میراجی کی شرم حضوری قابلِ دید تھی - شربت کا گلاس پینے سے پہلے اور بعد میں بھی وہ میزبان پر ذرا بھی نگاہ نہ ڈال رہا تھا - اسکی حالت گنگوں بہروں جیسی تھی، حالانکہ میوزک انچارج نے اُسے کماری یادو کے بالکل سمکھ[4] بٹھایا ہوا تھا - وہ تو گویا نقاب اٹھائے ہوئے تھی - اب اگر یہ ہی اُس کی آنکھوں میں آنکھیں نہ ڈالے تو یہ اسی کی قصوری تھی - اہیر لڑکی کو مہمانوں کا یہ رویہ سخت ناپسند گزرا، جنے پاؤں میں ایک جراب سفید پہنی ہوئی تھی، دوسری سیاہ - اور اُس نے ایک موزے پر دوسرا موزا پہنا ہوا تھا -

---

[1] بھے : خوف
[2] نماشام :
[3] نمچی : نیم کے درختوں کا جھنڈ -
[4] سمکھ : سرمکھ : سامنے

جب یونہی کچھ دیر ہوگئی، تو میراجی نے بڑی ڈکار لی، کھانسا اور چھینک کر جمائیاں لیتے ہوئے زور زور سے ہچکیاں لینے لگا، اُسے تو اُبکائی سی بھی آرہی تھی، جبھی پاس والے کمرے سے بچّے کے رونے کی آواز پر، کماری یادونے جاکر بچّے کو چُپ کرایا، اور اسے لئے ہوئے لوٹی۔ میراجی اب بھی زور زور سے ہچکیاں لیتے ہوئے نقش بر دیوار بنا بیٹھا تھا۔ کم سن بیوہ بچے کو اپنا دودھ پلا رہی تھی، اور میوزک انچارج اُسکی طرف دیکھ رہا تھا لیکن میراجی نہیں، اُسے ہِکّمک[1] نے پاگل بنایا ہوا تھا۔

دودھ پلاکر وہ بچے کو چھوڑ آئی، اور میراجی کو مخاطب کیا: "میراجی شوبھِت[2] ودھوا کے درشن کے لئے آپ کے دل میں اتنی ہلبلی مچی ہوئی تھی، پھر درشن کیوں نہیں کرتے؟ اِتنی شِشٹتا[3] اچھی نہیں ہوتی۔ آپ میراکرسٹانی نام پوچھا تھا۔ تو وہ کرن مالا ہے۔ اب اُس سے بات تو کرو، بات تو کرو، بات تو کرو، بات تو کرو۔ نہیں کرتے؟" اُس نے یہ الفاظ بار بار کہے "بات تو کرو" مگر میراجی کے منہ میں تو گویا زبان ہی نہیں تھی۔ یا اس نے روزۂ مریم رکھا ہوا تھا۔

وہ پھر بولی: میراجی جی، شری مان جی جی، اُبکائیاں لینے کیا آپ یہاں مسخر گی، ڈکاریں لینے، کھانسنے، چھینکنے، جمائیاں اور ہکھک کے لئے آئے

---

[1] ہِکّھک: ہچکیاں لینا۔

[2] شوبھت: حسین۔

[3] شِشٹتا: عاجزی۔

تھے، اور کیا یہ ٹھک ٹھک بند نہیں ہو سکتی؟" اب پھر پاس والے کمرہ سے بچے کے رونے کی آواز آئی، اور وہ یہ کہتی ہوئی ڈرائنگ روم سے چلی گئی "یہ ڈھیرا[1] واہول[2] آپکے پلے کہاں سے پڑ گیا؟ اب میں آپ سے بدا ہوتی ہوں، آپ مجھ سے بدا ہو جائیں۔ انہیں تو اپنی ٹھک ٹھک سے ہی سبیتا[3] نہیں۔ واہ جمائیاں لینے والے ڈکارو اور چھینکو جی۔"

کرن مالا عرف کُماری یادو کے جانے کے بعد میراجی کی ٹھک ٹھک بند ہو گئی، اور اس نے میوزک ڈائریکٹر سے کہا: "اب انہیں بلا لو، میری ہچکیاں بند ہو گئی ہیں، میں جانے سے پہلے اُن کے درشن تو کر لوں۔ میں تو اُن کا دیدار قدر مایہ[4] تک نہ کر سکا۔ انہیں کچھ تو سُشلتا[5] دکھانا چاہیئے تھی۔"

میوزک ڈائریکٹر: جس وقت اُن کا درشن کرنا تھا، اسوقت نہ کیا، تو اب کیا کرو گے۔ تمہاری ٹھک ٹھک تو ایک اچھا خاصا ہنگامہ تھا۔ اور ڈکار چھینکیں کھانسی، جمائیاں، اُبکائی بھی آنا تھیں تو اُسی وقت آنا تھیں۔

میراجی: میری ڈکار، چھینکیں، کھانسی، جمائیاں، اُبکائی اور ہچکیاں خود آور نہیں تھیں۔ میں تو انہیں بہتیری روکتا رہا، لیکن وہ آ ہی گئیں، جنھوں نے میری سُدھ گدلا دی تھی۔ میں نربُدھی[6] ہو گیا تھا۔ اب دیکھئے کیسی رکی ہوئی ہیں۔

---

[1] ڈھیرا: بھینگا۔ Aquint - eyed

[2] واہول: کھیتوں میں کھڑا ڈھوکھا برائے ڈرائے سور، گیدڑ وغیرہ۔

[3] سبیتا: فرصت۔

[4] قدر مایہ: بہت کم۔

[5] سُشلتا: خوش خُلقی۔

[6] نربُدھی: ابلیہ۔ بے عقل۔

میوزک ڈائریکٹر، جب کشتی خشکی پر چڑھ گئی، تو پھر چپو چلانے سے کیا فائدہ۔ اب میوزک ڈائریکٹر اور میراجی باڑا ہندو راؤ کی گلی سے نکل آئے۔ اہیر لڑکی پھر ہارمونیم پر گا رہی تھی ؎

شغل گر چاہتے ہو دل کے بہلنے کے لئے
دل میں آجاؤ کلیجہ میرا ملنے کے لئے

(داغ دہلوی)

اس نوجوان بیوہ کو اسکا جوانا مرگ شوہر یاد آ رہا تھا۔ اور وہ اُسے اس لئے بھی یاد آ رہا تھا کہ گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں۔ مہاڑی[1] کی کھڑکیوں کے پردے پُروائی کے جھونکوں سے پھڑ پھڑا رہے تھے۔ اِس سے ایک طرف تو کماری یادو کی جوششِ بڑھی جا رہی تھی۔ دوسری طرف بالا خانہ کے پاس سے گزرتا ہوا میراجی اس سے مطلب یہ نکال رہا تھا کہ جیسے اسکی شمعِ زندگی بجھنے کے لئے بھڑک رہی ہو۔ میراجی کی پہلی حقیری چوکیدار کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ اور یہ دوسری حقیری کماری یادو کے ہاتھوں۔ وہ ایسی کڑواہٹ محسوس کر رہا تھا کہ جیسے اُسے نِکتِکا[2] کھلائی جا رہی ہو۔

پہلے عقبہ سے پچھاڑیں کھا کر، اور بعد میں کماری یادو سے، میراجی کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اسے دہلی کی ہوا تک کراہتی اور بلاپ[3] کرتی ہوئی معلوم

---

[1] مہاڑی: بالا خانہ

[2] نِکتِکا: (امؤ) ایک سخت کڑوی چیز [3] بلاپ: گریہ وزاری

ہونے لگی۔ وہ جدھر نظر اٹھاتا، اُسے یوں لگتا کہ جیسے ایک اقلف[1] عقمہ[2] کے ساتھ رفس[3] و رف[4] میں مشغول ہو۔ اسکے کانوں میں ایک ہندو بھائی کی اپنی مادر بجطا سوتیلی بہن کے ساتھ دمادم کی آوازیں آتی رہتی تھیں اور یہ اُن کے سر پر مارنے کے لئے لوہے کا آتشین گرز تانے کھڑا ہو۔ لیکن وہ یکسر[5] ایسے جزوِ لایتجز[6] بنے ہوئے ہیں۔ کہ اُن کا الگاؤ[7] نا ممکن تھا۔ اُسکی سمجھ کہہ رہی تھی کہ عقمہ پر گرم رکابی[8] سے ایسے ہی زخم آگئے ہیں جیسے گھوڑی کی پشت پر بے جا کساؤ[9] کی بندش سے آجاتے ہیں۔ فارسی والوں نے گھوڑے کی کمر کے ایسے زخموں کو جزل کہا ہے۔ اُسے اس کا بھی تحسّر[10] و تہزّن[11] تھا کہ اُس نے کرن مالا عرف کماری یا دو یعنی اہیر بچی سے باوجود اُسکی قدرے یک جہتی[12] سے ایسا لطفِ دید و گفتار تک حاصل نہ

---

۱ اقلف: غیر مختون

۲ عقمہ: بہت سفید

۳ رفس: عورت سے جماع میں باتیں کرنا۔

۴ رف: عورت سے بوسہ بازی۔

۵ یکسر: تمام و کمال۔

۶ جزوِ لایتجز: اک دوسرے میں اتنے مدغم کہ جدا نہ ہو سکیں۔

۷ الگاؤ: ایک دوسرے سے جدا کرنا

۸ گرم رکابی: تیز سواری

۹ کساؤ: کسنے کا فعل

۱۰ تحسّر: حسرت ہونا

۱۱ تہزّن: رنج ہونا

۱۲ یک جہتی: توجہ

کر سکا جیسا عقمہ اُسے دے چکی تھی۔ اسکی تو ڈکار، چھینکوں، جمائیوں اور ہچکیوں نے زیادہ ہی کام بگاڑ دیا تھا۔ اُسے اتنی ہچکیاں کبھی نہیں آئی تھیں۔ وہ انہیں جتنا روک رہا تھا۔ اتنی ہی زیادہ آرہی تھیں۔

اب میراجی دہلی چھوڑ کر فلموں سے مُنسلک ہونے کے لئے بمبئی جا رہا تھا۔ اُس نے ڈبیہ والے دوست کو نہایت کم مائیگی کے ساتھ بہ صد تہزن و تحیُّر و بلا القاب آداب اس طرح کی چٹھی لکھی تھی۔ میں اس بوساگر[1] میں کوئی نچھل[2] دھرماتما[3] نہیں۔ بہت پاپی ہوں۔ لاہور میں میری اِچھا تھی کہ میں میرا سین کو مالیوان[4] لیجا کر اُسے اپنا مرکب[5] بناتا رہوں۔ پر ایسا نہ ہو سکا۔ اس بنگالن کی سروِس میں مجھ بارہ ماسئے کو اتنے سال ہو چکے ہیں اور اُسکے لئے چنکاریاں مارتے ان حالوں کو پہنچ گیا ہوں کہ ؎

نامہ تلک گیا نہ کوئی نامہ بر گیا
تیری خبر نہ آئی، زمانہ گزر گیا

(سیماب اکبرآبادی)

میں دہلی پہنچ کر بھی نچھکا[6] نہ رہا۔ یہاں صفیہ مُعینی "سحاب قزلباش" مسز حمیدہ حسین، عقمہ اور کرن مالا اہیر نی تھیں۔ انہوں نے اپنی گیدڑ سنگیوں سے مجھے اِتنا متوالا کر دیا تھا کہ میری جو روز شیبوہ کی عادت تھی، اب شیبوہ نہ

---

[1] بھوساگر: دُنیا

[2] نچھل: پاکباز

[3] دھرماتما: صالح

[4] مالیوان: ہندو دیو مالا میں میرو پہاڑ کے پاس سلسلۂ کوہ۔

[5] مرکب: وہ کہ جس پر سواری کی جائے۔

[6] نچھکا: پاکباز

ہونے کے سبب میرے چہرہ پر جوئیں اور ڈھیرے سے نمودار ہو گئے تھے۔
مجھے اس کا آج تک افسوس ہے کہ جب میں بال ودھواسی اہیرنی سے ملنے گیا تو میری وہ پورشتا کہاں چلی گئی تھی جو پورشتا عقمہ پہ اس طرح سے کھیل رہی تھی جس طرح سانپ ساون میں جھکی ہوئی گھٹاؤں کے وقت بجتی ہوئی بین پر کھیلا کرتا ہے۔ ایسے سمے تو بین سانپ کے بھٹ کے پاس بجائی جائے تو یہ کیڑا پھنا اٹھائے ہوئے لہراتا ہوا نکل آیا کرتا ہے۔ میرا سین نے مجھے کبھی نہیں دُھتکارا، بال ودھوا ایسی نے تو دنائت[1] میں آکر مجھے بھینکا ڈھوکھا[2] تک کہہ ڈالا تھا۔
میرا سین پوشپ[3] اور مدھو پرس[4] ہے اور گربی[5] نہیں۔ دلی کی لڑکیاں مدمغ ہیں اور اہیرنی تو بچھی[6] ہے۔ جس نے مجھے ایسا ڈسا کہ لہریں خبر نہیں کب بند ہونگی۔ اسی نے یہ میری پیچ[7] ہے کہ میں میرا سین کا دلی بارہ ماشیا[8] بنا رہوں گا۔ میرے منہ سے اُس کے لئے ہمیشہ یہ بول نکلتے رہیں گے۔

ے سو بار جنم لیں گے
پھر بھی نہ جدا ہونگے

---

[1] دنائت : کمینگی
[2] ڈھوکھا : کھیتوں میں اجاڑ کرنے والے جانوروں کو ڈرانے کیلئے پتلا۔
[3] پوشپ : پھول جیسی۔
[4] مدھو پرس : (مذکر) رس بھرا میوا۔
[5] گربی : مغرور
[6] بچھی : بچھو
[7] پیچ : (مؤنث) عہد۔
[8] بارہ ماسیا : بارہ مہینہ کا نوکر۔

"میرا سین میری رادھا نی تھی، پر میں اُسکا شیام نہ بن سکا"

میراجی کا دہلی سے جانا ایسا تھا جیسے واجد علی شاہ کا لکھنؤ چھوڑ کر کلکتہ جا کر میٹا محل میں جا رہنا یا بہادر شاہ ظفر کا دہلی لال قلعہ چھوڑ کر رنگون جلاوطن ہو جانا۔ دہلی میں اُسکے لئے صفیہ عتیقی تھی۔ سحاب قزلباش، مسز حمید حسین تھیں۔ اور اِن سب سے زیادہ عقمہ اور کرن مالا یادو۔

آل انڈیا ریڈیو دہلی کے عملہ نے میراجی کے لئے الوداعی ضیافت کا اہتمام کیا تھا۔ مگر رات کو بہت دیر ہو گئی۔ تو دعوت کنندگان کو مجبوراً کھانا نمٹانا پڑا تھا۔ کیونکہ مہمانِ خصوصی میراجی، تو بارہ ہندو راؤ میں کماری کرن مالا کے گھر کے پاس والی نیچے تلے کھنڈ ان روں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے وہ اُن میں اپنی بدقسمتی کا تارا ڈھونڈھ رہا ہو۔ یہاں سے وہ صفیہ عتیقی کی بھوجلہ پہاڑی کا چکر لگا کر عقمہ کی گلی قاسم جان چلا گیا تھا۔ اِسکی آنکھیں جیلی قبر، حویلی اعظم خاں اور کالی مسجد (کلاں مسجد) کو اس طرح سے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی اُجڈ گنوار پیرس کے بازاروں کو مُنہ پھاڑے ہوئے دیکھ رہا ہو۔

باب نمبر ۷

بمبئی اور رستمی

۳۵

میراجی بمبئی میں جی۔آئی۔پی ریلوے کے وکٹوریہ ٹرمینس اسٹیشن پر شام ہوئے اترا۔ تو اُسکی ہیئت بے مایہ سے گینی لورڈ ایسی تھی۔ اُسے یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ اسکی رات کہاں گزرے گی۔ وہ آج تک فٹ پاتھ پر نہیں سویا تھا۔ لیکن آج تو اُسے وہیں بسر کرنا تھی۔ وہ اپنی مختصر پونجی سے اپنا پیٹ تو موٹے جھوٹے کھانے سے بھر سکتا تھا، لیکن اتنی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کسی ہوٹل، یا سرائے میں ٹھہر سکے۔ وہ اِسی سرگردانی میں پلیٹ فارم کی بنچ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دہلی سے بمبئی تک تیسرے درجہ میں مسافت طے کی تھی۔ اور وہ اتنے لمبے سفر میں بھیڑ کی وجہ سے سو نہ سکا تھا۔ بے آرامی اور تھکن سے اُسکا سر تو بھاری ہو رہا تھا۔ اور آنکھیں چُندھیا چندھیا کر مچی جا رہی تھیں۔ اسٹیشن کی دیواروں پر جو مُذہب چوکھٹوں میں بمبئی کے نظاروں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں، وہ اُسے خونخوار درندے اور اژدہا دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن اُسے عقمہ کے ساتھ

کی یاد کا مزہ بھی آ رہا تھا -(پیر بنا)، اُسے بھوک بھی بہت لگی ہوئی تھی۔ لیکن مسکنت[1] و عسارت کے سبب وہ اسٹیشن کا مہنگا کھانا نہیں کھا سکتا تھا۔ اُسے تو کسی گلی میں جا کر ڈھابے سے روٹی کھانا تھی ۔ جبھی وہاں ایک پالش والا گزرا جس نے اُس کے گرد آلود جوتے دیکھ کر پالش کرنا چاہی، لیکن میراجی نے اُسے ٹال دیا۔ پھر وہیں بیٹھے بیٹھے اُس کی آنکھیں بند ہو کر غفلت طاری ہو گئی۔

وہ اُس وقت جاگا جب اُردو کے مشہور ادیب اور افسانہ نگار نے اُس کے شانے ہلکے ہلکے ہلائے۔ یہ کرشن چندر تھا۔ جس کے افسانے مولانا صلاح الدین احمد کے "ادبی دنیا" میں چھپا کرتے تھے۔ اور میراجی بھی اس رسالہ میں کام کیا کرتا تھا۔

میراجی کو کرشن چندر کی موجودگی ایسی معلوم ہوئی کہ جیسے سکندر کو آبِ حیات مل گیا ہو۔

کرشن چندر محبت روی کے ساتھ بولا: "میراجی اُس بنگالن کو لاہور ہی میں چھوڑ کر بمبئی آ گئے؟"

میراجی: وہ تو میرے لاہور چھوڑنے سے پہلے ہی کہیں چلی گئی تھی۔ اور میں یہ سوچتا رہ گیا تھا کہ گویں اُسے اپنے رجواڑے میں نہ لا سکا مگر میں پھر بھی خود کو بھرشٹا راجیا[2] سمجھتا رہ گیا تھا۔

کرشن چندر: اور بھرشٹا راجیا پھر بھی لاہور میں ہی ٹھہرے رہے تھے۔

میراجی: بھرشٹا راجیا دِلی آ گیا تھا۔ جہاں اُسے ریڈیو پر ڈھائی سو روپیہ کی نوکری مل گئی تھی۔

---

[1] مسکنت: محتاجی

[2] بھرشٹا راجیا: وہ راجہ جسکے ہاتھ سے اُسکی راجائی نکل گئی ہو۔

کرشن چندر : وہاں تو اسکی خوب گذری ہو گی؟
میراجی : وہاں اسکے ساتھ یہ ہوا ؎
دست از یک بند تا اُفتاد در بندِ دِگر
یعنی میراسین کے بعد چشمِ بیمار صفیہ عتیقی، مٹھ بولی سحاب قزل باش، ملکۂ حسن مسز حمید حسین، اور سب سے زیادہ سوداگر بچّی، عقمہ اور اُس سے بھی زیادہ بال دِ دھوا کرن مالا یادو۔
کرشن چندر : اِن آخری والیوں سے تو خوب گزری ہو گی۔
میراجی : خوب کیا گزرتی اِن سے بھی کچھ ہاتھ پلے نہ پڑ سکا۔ یہ عقمہ بنتی تو تھی گلی قاسم جان کی سوداگر بچّی۔ لیکن اُسکا فرضی باپ ایک کثیرالاولاد گنڈیریاں بیچنے والا تھا۔ یہ لونڈیاں ایک امیر لونڈے سے پھنسی ہوئی تھیں، جس کا بنگلہ، رِشی بھون، اُس رج کے پاس تھا، جہاں انگریزوں نے بلوائیوں کو شکست دی تھی۔
کرشن چندر : تم یہ کیسی بازاری زبان بولنے لگی ہو۔ پھنسی ہوئی۔
میراجی : وُہ اُسی زبان کے لائق ہے۔ میں نے اُسے رام لیلا کے میدان دیکھا۔ بال کٹوائے ہوئے۔ سر پہ ہری طوطا کشتی نما ٹوپی، گلا کھلا ہوا۔ اور اُسی لونڈے کے ساتھ چلی جا رہی ہے۔
میراسین : اوہ وہ تو پرترتا کی جان تھی۔
کرشن چندر : یہاں کوئی تمہارا ٹھور ٹھکانا بھی ہے۔
میراجی : میں تو بر شاخ آہو ہوں۔
کرشن چندر : میرا کاشانہ بمبئی سے کوئی پچیس میل ایک اُجاڑ مسطح[1] میدان میں ہے۔ جہاں اب تک صرف چار کوٹھیاں بن سکیں۔ اِسی لئے یہ

---

[1] مستطح : پھیلا ہوا۔

چار بنگلہ کے نام مشہور ہے۔

میراجی : کیا وہاں اِس فقیر کے لئے گنجائش ہو گی ؟

کرشن چندر : میں نیچے رہتا ہوں۔ اوپر تین بڑے ہال ہیں۔ وہیں ایک ایسی کھڑکی کے پاس، جہاں سمندر کی بھیگی بھیگی ہوائیں آتی ہیں، تم بھی اپنا ڈیرہ جما لینا، چارپائی پا بستر کا تو کوئی بندوبست نہیں۔ جس طرح بہت سے لاہور اور امرتسر سے بمبئی آنے والے تہ میدانی[1] ادیب وہاں لوٹ لگاتے رہتے ہیں۔ تم بھی ایسا ہی کرنا۔ اور مُفت راحت گفت۔ تم اس بالاخانہ سے بحیرۂ عرب پر نگاہ دوڑاؤ گے تو موجیں ساحل کے ساتھ ٹکراتے ہوئے سر کھپا کھپا کر جھین اُٹھاتی ہوئی نظر آئیں گی۔ وہیں گل مہر بھی قطار در قطار کھڑے ہیں۔

۲۶

اسٹیشن سے باہر آکر میراجی اور کرشن چندر ایک ٹیکسی کار میں بیٹھ کر چار بنگلہ کو روانہ ہو گئے۔ منزل پر پہنچ کر میراجی نے دیکھا کہ یہ ایک سٹیپ[3] قسم کا لق و دق میدان ہے۔ جس میں درخت کا تو نام ونشان نہیں۔ البتہ کہیں کہیں گنجی سی دُوب ضرور ہے لیکن بس اسٹینڈ کے جنوب میں کوئی دو سو قدم پر پہلی کوٹھی کے پاس ایک ضخام[2] اور پھلوان ریکھر کا پیڑ کھڑا ہوا تھا۔ اس سمندر آور دریتلی سی زمین میں کافی کھار اور نمی تھی۔ پاس پس کا اجاڑ سا

[1] تہ میدانی : بے گھر۔
[2] ضخام : بہت بڑا۔
[3] اسٹیپ : (Steppe) ۔ ایسا ایشیائی میدان جہاں درخت نہ ہوں۔

اسٹاپ بھی تھا۔

جس اُوپر کی منزل والے بڑے ہال کمرہ میں میراجی کو جگہ ملی، وہ اتنا بڑا تھا کہ وہاں سو مسافر ٹھہر سکتے تھے۔ اور اس میں چاروں طرف بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں۔ اس فرودگاہ میں کوئی دس ادیب بسیرا کر رہے تھے۔ جن میں کوئی شاعر تھا، کوئی افسانہ نگار، کوئی ناولسٹ، کوئی اخبار کا کالم نویس۔ ان سبھی نے ایک ایک کھڑکی کے پاس فرش پر بستر لگائے ہوئے تھے۔

میراجی نے اپنا بستر سمندر کی جانب والی کھڑکی کے پاس لگایا تھا۔ اور یہاں سے جنوب مشرق میں ایک پارسی نوشیرواں اڈلجی پوچکاں والہ کی پیلی کوٹھی تھی۔ جو ولائتی شراب بیچا کرتا تھا۔

ہال میں ایک ٹھہرنے والے کے پاس تین دن تک خوراک کرشن چندر سے اس کے بھائی مہندر ناتھ کے ہاتھ پہنچتی تھی۔ اس کے بعد اُسے خود بندوبست کرنا پڑتا۔ ہال میں روشنی کے لئے بہت سے بلب لگے ہوئے تھے بیچ میں ایک بڑا بلب بھی تھا۔ نہانے کے لئے غسل خانوں کی قطار سی تھی۔

میراجی تین دن تک ہال میں سستاتا رہا۔ لیکن اس عرصہ میں اسکی سب سے زیادہ کلمشکل یہ تھی کہ وہ میرا سین کی تصویر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جو اسکے بھدّے سے جستی ٹرنک میں بہ حفاظت موجود تھی۔ چوتھے دن وہ میرا کی تصویر چادر میں چھپائے سمندر کے کنارے پہنچا۔ جہاں گل مہر قطار در قطار کھڑے تھے۔ اور بحیرہ عرب کی پھین اُٹھاتی ہوئی پُرشور موجیں آ آکر نیست و نابود ہو رہی تھیں۔ اُس نے تصویر ایک گل مہر کے تنے پر لگائی۔ اور اُسے دیر تک سجدہ کرتا رہا۔ وہاں کچھ گھومنے والے آئے، جنھوں نے اُسکی یہ دشا دیکھی تو ہنسنے لگے۔ لیکن میراجی نے سجدہ ریزی ترک نہ کی۔ اب اس کا یہ سوبھاؤ ہو گیا تھا کہ یہاں سویرے سویرے آکر میرا سین کی تصویر کے سامنے گھسنی کرے۔

کچھ عرصہ بعد اُسے فکرِ روزگار پیدا ہوئی۔ تو وہ بس میں بیٹھ کر شہر گیا جہاں ایک اخبار کے دفتر میں اُسکی ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی، جو پروف ریڈر تھا۔ اُسکی شادی ہونے والی تھی۔ اور یہ رخصت لیکر لکھنؤ جانے والا تھا۔ جہاں اُس کی بود و باش لکھنؤ یونیورسٹی کے نزدیک محلہ ڈالی گنج میں تھی۔ پروف ریڈر خوش تھا کہ اُسے اتنی جلد عیوضی مل گیا۔ اور وہ بھی شاعر کیونکہ اِسے بھی شاعری سے مس تھا۔ اور اسکی غزلیں اخبارات میں چھپتی رہتی تھیں۔ اسکی تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار تھی۔ اور میراجی کو بھی اس کی جگہ کا یہی مشاہرہ ملنا تھا۔

جانے سے پہلے پروف ریڈر نے میراجی کی دعوت بھی کی تھی اور ان دونوں میں اتنے تعلقات پیدا ہو گئے تھے۔ کہ میراجی کی ناداری کا خیال کرتے ہوئے، پروف ریڈر نے اُسے دو سو روپے پیشگی ادا کر دیئے تھے۔ میراجی نے اپنے محسن کو اپنے نام کی وجہ تسمیہ بھی بتا دی تھی۔ جس نے لکھنؤ سے واپس آکر اپنے عیوضی کو کوئی اور آسامی دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب میراجی کی فکرِ نان نفقہ کم از کم عارضی طور پر رفع ہو گئی تھی۔

پروف ریڈر ایک ماہ بعد واپس آیا۔ تو اس نے میراجی کو خبر دی کہ مِس میرا سین یونیورسٹی کے شعبۂ انگریزی کی جونیئر لکچرر اِسی کے محلہ ڈالی گنج میں رہتی ہے اس نے اِسکا بنگلہ بھی دیکھا تھا۔ لیکن وہ اسے بالکل جچی۔ میراجی نے اس سے دریافت کیا: "اس میں کیا نقص ہے"؟۔

پروف ریڈر: اُس میں شئے لطیف کی کمی سی معلوم ہوتی ہے۔

میراجی: یہ تو آپ نے ایک عام سی بات کہدی۔

پروف ریڈر: اُسکا نچلا ہونٹ دبیز سا ہے۔

میراجی: اِسی لئے تو اس میں ہنسی مُکھی پیدا ہوئی۔

پروف ریڈر: مجھے تو وہ ماجدہ سی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کا شمار تو

معظمات[1] میں ہونا چاہیئے۔
اُس کے بنگلہ پر سنکھ کی تصویر بنی ہوئی ہے۔
میراجی : اگر وہ اپنے دبیٹ[2] ہونٹوں سے سنکھ بجائے، اور اس کا دبیز سالب زیریں سنکھ سے لگے، تو میری رشک سے جان نکل جائے گی۔

ا۔ یہ لڑکی اپنی کیولتاؤں[3] میں لق و دق ریگستان کے کسی چیچلیہ پر کھڑا ہوا کیکر کا پیڑ تھا، جس کے پتے بلا کے سبز تھے اور پھول بلا کے زرد۔ اس پر لگے ہوئے لمبے لمبے سفید سفید سولوں کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا یہ سُول ایسے معلوم ہوا کرتے تھے کہ جیسے اس پر بجائے پتوں اور پھولوں کے صرف سول ہی سول ہوں۔
ذوالفقار علیؑ کے متعلق روایت ہے کہ جب اسے چلایا جاتا تو یہ اپنی لمبائی سے بہت زیادہ آگے بڑھ کر دشمن پر مار کیا کرتی تھی۔ تو یہی حال گویا اس کیکر کے سولوں کا تھا۔ کہ یہ بھی اپنی لمبائی سے بہت زیادہ آگے بڑھ کر گزرنے والے کو چُبھنا چاہا کرتے تھے۔
پیلی کوٹھی کے پاس کھڑے ہوئے کیکر میں بھی ایسی ہی خوبیاں تھیں۔ اس پیڑ میں مزید خصوصیت یہ بھی تھی کہ یہ سموم میں لہراتا تھا۔ اور ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آتا تو یہ کملایا ہی نہیں جاتا تھا بلکہ یہ کیکر اپنے سُول سیہ کی طرح پھیلا لیا کرتا تھا
پیلی کوٹھی کے پاس کھڑے ہوئے کیکر کے پیڑ نے اس وحشت زدہ ماحول کی وحشت کو دوچند کیا ہوا تھا۔

---

[1] معظمات : قابل عزت چیزیں۔ [2] دبیٹ : (مست) پیار کے قابل۔
[3] کیولتا : خصوصیت

۳۷

میراجی ہر روز شام ہوئے بس میں بیٹھ کر شہر جایا کرتا تھا۔ اگر بس دیر میں آتی تو اُسے اسٹاپ پر اُس کی نگاہ اکثر اپنے معمورہ کی ایک لغین[1] اور وحشی سے نقشہ والی لڑکی پر پڑا کرتی تھی۔

یہ قلانچیں بھرتی ہوئی سی گستہ مہار[2] اور دو بستہ[3] ہونے کو تیار لڑکی تجریدی مصوری کا بلوان[4]، بسیلا[5] اور اُجڈ مرقع تھی۔ اُس کا پیشہ گھٹیا ہوٹلوں اور ڈھابوں میں ناچنا تھا۔ ایک دن یہ اور میراجی اسٹینڈ پر بس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ میراجی اتفاقاً اس کے پاس ہو گیا۔ تو یہ تھری لڑکی منہ بناتے ہوئے از حد تنافس[6] تمکنت، اور ڈھٹائی سی بولی :۔ ارے اُلو دا سری لُر مجھ سے کیوں بھڑا جا رہا ہے۔ ارے ہرائسہ[7] پرے ہٹ، جو شمہ برابر بھی ادھر سرکا، تو ناچخ[8] نہیں، تو اک ڈھکے کتھپڑ ضرور رسید کروں گی۔ بھتو بڑا[9] بھر جائے گا۔" میراجی پرے

---

[1] لغین : موٹے ہونٹوں والا۔ [2] گستہ مہار : شتر بے مہار۔
[3] دو بستہ : حاملہ عورت
[4] بلوان : طاقتور
[5] بسیلا : زہریلا۔
[6] تنافس : سانس لینا۔ غرور۔
[7] ہرائسہ : کھیت میں پرندوں کے ڈرانے کا پُتلا۔
[8] ناچخ : چھوٹا تیر
[9] بھتو بڑا : توہین کے طور پر منہ کو کہتے ہیں۔

ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ تمام راستہ اس کے ساتھ دبد کی آنکھ مچولی کھیلتا رہا۔ اور وہ میراجی کے دل میں ایسی بیٹھ گئی کہ اُس نے میراسین عقمہ اور کماری کرن بالا بادو کو معطّل و مقدوم کر ڈالا۔

میراجی کی طبیعت چاہ رہی تھی کہ اِس لڑکی کے ساتھ کبھی عقمہ کی طرح سے کبھی یہ اُس کے ماترا لگائے تو کبھی وہ اِس کے۔ لیکن وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ عقمہ تو کچھ کچھ دھان پان سی تھی اور وہ اس پر حاوی ہو سکتا تھا۔ لیکن یہ قوی جسثہ اتنی مہا شکتی مال اور معرکہ گیر تھی۔ کہ وہ اس کے اُدبر کا پاٹ نہیں بن سکتا تھا تاوقتیکہ یہ لڑکی ایسا خود ہی بطور باری دینے کے نہ کرے۔

گو ہاتف آواز دے رہا تھا کہ میراجی اِس سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش نہ کرے، یہ لڑکی تو ولد الزنا ہے۔ ویسے میراجی تو باوجود اِس تناہی[1] کے اس کے ساتھ زیر ہونے کے لئے جان کی بازی لگانے کو تیار ہو گیا تھا۔ پر اُسے یہ ڈر بھی تھا کہ کہیں یہ اور ایک لڑکی واقعی میں چھکڑ[2] مار کر اِسکا منہ نہ پھیر دے۔ پر کچھ ہی میراجی اُسکا دامن[3] بن گیا تھا اور وہ اِسکی دیش[4]۔ قدرت انگشتِ بدنداں تھی کہ سانپ کے اتنے روزنوں سے ڈسا جانے کے بعد میراجی نے سانپ کے اور روزن پر کیوں انگلی رکھ دی۔

اِسوقت میراجی کو چار پرندے سامنے بیٹھے ہوئے نظر آرہے تھے۔ بُلبُل، قمری، پپیہو اور ترمتی۔ میراسین بنگالن کبنولی بُلبُل تھی، گلی قاسم جان کی

---

[1] تناہی = منع کرنا۔

[2] چھکڑ = بڑا پتھر۔

[3] دامن = ایک مرد جو ویش پر عاشق تھا۔

[4] اس عورت پر دامن عاشق تھا۔

سوداگر بچی، عصمت، قمری، بال دھوا، کرن بالا اہیرنی، تیہو اور یہ بس اسٹینڈ والی گوشت خور ترمتی۔ لیکن بڑی ہی بھوک لگادے۔ قسمان عربی میں بہت بڑے گدھ کو کہتے ہیں۔ تو اگر کوئی قسمان اس ترمتی کو اوڈا[1] کرنا چاہتا، تو بلا اسکی مرضی کے اوڈا نہ کرسکتا۔ اگر پاربتی کی جگہ یہ ہوتی، تو کورو بھرے دربار میں اس کی ساڑھی اتارنے کی جرأت نہ کر سکتے۔

گورستی میراجی کو اتنا ددلا[2] چکی تھی، مگر وہ خود کو اس طور تشفی دے رہا تھا۔ کہ جان پہچان پیدا کرنے کے لئے بھی بہت سے ڈھنگ ہوتے ہیں۔ ایک ان میں سے کسی کی تضحیک کر کے خاکہ اڑانا بھی ہے۔ رستمی نے جو اسے لُرکہہ کر پکارا ہے، تو لُر کے معنی احمق کے ہیں۔ ایسا اس نے بے تکلفی پیدا کرنے کے لئے کہا ہوگا۔ اور رہی پھیڑانے کی بات، تو وہ اسے کہاں پھیڑاتی۔ یہ بد خلقی بے تکلف ہونے کی مزید کوشش تھی۔

آج جب وہ پروف ریڈنگ کر رہا تھا۔ تو اس کا دھیان اس درشت لڑکی ہی میں تھا۔ اسے اس کی سانتھلوں کا خاص طور پر خیال آرہا تھا کہ وہ یقیناً بھاری ہونگے۔ اور اس کے ساتھ طبق زنی میں عصمت سے بھی زیادہ لطف آئیگا۔ اسے میراسین بھی یاد آرہی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے ساتھ طبق زنی ممکن ہی نہیں۔ بلکہ مناسب بھی نہیں تھی۔ اسکی لوترتا کا تو یہ تقاضا تھا کہ یہ اس کا کیول[3] پوجک[4] بن جائے یا پتوبن[5] کی کسی کٹی میں بیٹھ کر اس کے دھیان گیان میں گم ہو جائے۔

---

[1] اوڈا کرنا: جھکانا۔

[2] ددلانا: برا بھلا کہہ کے ذلیل کرنا۔

[3] کیول: صرف۔ [4] پوجک: پرستار

[5] پتوبن: راہبوں کی سوچ بچار کے لئے جنگل۔

۳۸

یہ سردیوں کے دن تھے۔ جنکی لمبی راتوں میں میراجی جاگتا رہتا تھا۔ اُسے اب یہ بھی سنک پڑ گئی تھی کہ وہ لمتڑ[1] اور چنڈال پارسی لڑکی کا آگا پیچھا معلوم کر سکے۔ جس پیلی کوٹھی میں وہ رہتی تھی۔ اُسکا فاصلہ کرشن چندر کی کوٹھی سے دکھن پورب میں کوئی آدھ فرلانگ سے بھی کم ہوگا۔ اور کرشن چندر کی کوٹھی بس اسٹینڈ سے سو ڈیڑھ سو گز تھی۔ کبھی کبھی میراجی تلملی کی تاب نہ لاکر آدھی پچھلی رات نوشیرواں پوچکاں والے کی پیلی کوٹھی کا پرکرما[2] کیا تھا۔ حالانکہ بدن سے چھن چھن کر نکلنے والی ٹھنڈی سمندری ہوا چلتی رہتی تھی۔

اس نے یہ بخوبی معلوم کر لیا تھا کہ پیلی کوٹھی کا مالک شراب فروش نوشیرواں پوچکاں والا ہے۔ لیکن اُسے یہ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ کہ اس پکے رنگ والی لڑکی کو پارسی کون کہہ سکتا تھا۔ مشہور ہے کہ گورا چمار حرام کا۔ اور پارسی بھی گورے ہی ہوتے ہیں، تو ہو نہ ہو یہ ملیاگیری[3] رنگ نہیں بلکہ آبنوسی لڑکی زردشتی نطفہ سے نہیں۔ کوے کے انڈے سے سفید کبوتر نہیں نکل سکتا۔ پھر اس نے یہ معلومات بھی بہم پہنچائی تھیں کہ نوشیرواں پوچکاں والا ایک مرتبہ ملیوار[4] کی پہاڑیوں میں معہ اپنی بیوی اور جوان لڑکی کے تفریح کی خاطر گیا، تو پہاڑیوں پر بھیڑ بکریوں کا ریوڑ چراتے ہوئے ایک کشیدہ اعضاء، گنگ[5]، کوار رنگ، بانکے اور جنگلی

---

[1] لمتڑ: طاقتور [2] پرکرما: طواف

[3] ملیاگیری: صندل کی لکڑی جیسا رنگ

[4] ملیوار: مالابار

[5] گنگ: موٹا

لڑکے نے بلا استحصال و استبداد پوچکاں والے کی لڑکی کی استرضاعے لیوٹیا[1] بن کہر اُسکی بکارت توڑ کر حمل رکھوا دیا تھا۔ اور یہ منہ زور اور گھرلی[2] لڑکی جو اب لولیوں[3] کی طرح سے ڈھابوں میں ناچتی پھرتی تھی۔ اِس کا باپ وہی ایک خانہ بدوش گلّہ بان تھا۔ اور اسے رستمی کہتے تھے۔ یہ اپنے نانا نوشیرواں پوچکاں والہ کے یہاں رہتی تھی۔ باوجود پیشہ ورپنی کے اُس میں استکبار پایا جاتا تھا۔ اب میراجی کو یہ ڈھارس بندھی کہ جب رستمی اتنی اسفل وبے وقیر ہے، ڈھابوں میں ناچنے والی اور بے تعلیم، تو یہ ٹِیس جماکر اُسکی قلبہ رانی کر سکیگا۔ یہ نیچ لوگوں کے اُن ڈھابوں میں جانے لگا۔ جہاں رستمی ناچا کرتی تھی۔ لیکن اس کا اِسے دیکھنا تھا۔ کہ وہ چلاّنے لگتی کہ اِسے محفل سے فوراً دھکے دے کر نکال دیا جائے، ورنہ وہ نہیں ناچے گی۔ اس سے میراجی بہت ہی ضیق میں آگیا۔ وہ اِسکی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہ تھی۔ رستمی کو علم تھا کہ میراجی شہر شام کے وقت جاتا ہے۔ اسلئے وہ اس سے پہلے ہی دن ڈھلے جانے لگی۔

وہ بس اسٹینڈ پہ اُسے دیکھ لیا کرتا تھا۔ اب اس سے بھی محرومی ہو گئی تھی اسکا مداوا اُس نے اسطرح کیا۔ کہ اُس نے بازار سے ایک دوبین خرید لی۔ وہ گاہے بگاہے نوشیرواں پوچکاں والہ کی کوٹھی کا پھاٹک، وہ سو گز کا راستہ جو یہاں سے سڑک تک جاتا تھا، اور بس اسٹینڈ کو قدر اندازوں کی طرح دیکھتا رہتا تھا۔

لکھنؤ کے پردف ریڈر تے، جس سے میراجی کے کافی تعلقات پیدا ہو گئے تھے، اُسے ایک اخبار میں دو سو روپیہ کی ملازمت دلادی تھی۔ یہ

---

[1] لیوٹیا: لینے والا۔ [2] گھرلی: زہری
[3] لولی: کسبی

مشاہرہ اسکی گزر کے لئے کافی تھا۔ لیکن جب سے اس نے دوربین خریدی تھی وہ کام سے غیر حاضر ہونے لگا تھا۔ اور مالک کو شکائت پیدا ہو گئی تھی۔ کچھ عرصہ لکھنوی پروف ریڈر کی سفارش اور اعانت سے مالک درگزر کرتا رہا۔ پھر میراجی کے محسن کو خود اُسکے ہی شہر لکھنؤ میں ایک اچھی نوکری مل گئی۔ اس لئے وہ بمبئی سے رخصت ہو گیا۔ بعد میں میراجی کی مالک سے نہ نبھ سکی۔ اور اُسے نوکری سے علیحدہ کر دیا گیا۔

۳۹

تو یہ دن تھے جب اسکے مرزبوم لاہور سے ایک حسن پرستہ ادیب سا لڑکا ،مشیر، بمبئی وارد ہوا۔ اس شہر میں ہر آنے والے بے آسرا ادیب کا ملجاد ماوا کرشن چندر کی وہی دور اُفتادہ کوٹھی تھی اور وہ بالاخانہ کے اسی ہال کمرے میں فرش پر بستر لگا کر لیٹ لگا سکتا تھا۔

میراجی میں حسن پرستی طفلی سے موجود تھی۔ جب یہ چھوٹی جماعت میں تھا تو اسکی کوشش ہوتی تھی کہ ڈیسک پر ایک چھب دار، خوش رُو اور منوہرن ہم جماعت، احمد لینئیر کے ساتھ بیٹھے۔ اُس نے شاہد بازی کی شروعات اس طرح سے کی تھی۔ وہ اپنے کورس کی کتابوں پر اسی لڑکے کا نام لکھا کرتا تھا۔ میراجی کو اپنے اس ہم جوار نووارد لاہوری لڑکے ،مشیر سے دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

یہ لڑکا مشیر اِس سے حیرت زدہ تھا کہ اُس کا یہ موجودہ پڑوسی دوربین لگا کر کیا دیکھتا رہتا ہے۔ اس نے میرا کی کہانی سُنی ہوئی تھی۔ اور میراجی کے نام کی وجہ تسمیہ بھی، اس لئے اُسکی فطانت نے اسے بتا دیا تھا کہ ہو نہ ہو اس کا ہم شہر یہاں بھی کسی پری کے سائے میں آیا ہوا ہے۔ چنانچہ ایک دن اس لڑکے نے میراجی سے دریافت کیا: "بھاجی آپ دوربین سے کیا دیکھتے رہتے ہیں"

میراجی : ایک گُل نافرمان کو آنکھوں ہی آنکھوں سے بھرشٹ کرنا رہتا ہوں

مُشیر : پربھاجی۔ ابھی تو دسمبر ہے۔ گُلِ نافرمان تو بہار میں کھلتا ہے۔

میراجی : ایک سدابہار گُل فرمان بھی ہے۔

مشیر : اور بھاجی آپ تو مسلمان ہیں، میں نے آپ کو سمندر کنارے گُل مہر کے استمبھ پر ٹنگی ہوئی ایک تصویر کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے سجدہ تو صرف خدا کو روا ہے

میراجی : میں مسلمان نہیں مورتی اپاسک ہوں۔ مورنی پوُجک ؎

حرم ہو، دیر ہو، کعبہ ہو، یا بُت خانہ
ہم کو تو نقشِ کفِ پا پہ ہے سجدہ کرنا

؎ بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ : بھاجی : پنجابی میں بھائی جی کو کہتے ہیں۔

؎ استمبھ : درخت کا تنا۔

باب نمبر ۸

بمبئی (جاری ہے)

جبھی رستمی اپنے نانا، نوشیراں۔ پوچکان والہ کی پیلی کوٹھی سے نکل کر بس اسٹینڈ پر جانے لگی، تو میراجی نے دوربین لڑکے کو دیتے ہوئے کہا:۔
دیکھو یہ ہے سدا بہار گلِ نافرمان، جس کی چوٹی میں سفید پھندنا لگا ہوا ہے۔
مشیر (دوربین لگا کر رستمی کو دیکھتے ہوئے) کہاں گلِ نافرمان اور کہاں یہ کالی کلونجی! مجھے تو یہ فلاخن[1] انداز ہی معلوم ہوتی ہے۔ اردا بیگنی۔ عورتوں کی بھرتی کرنے والے، اِسے اُڑ کر منتخب کر لینگے۔
میراجی:۔ اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنا نام بدل کر اِسی کے نام پر "رُستمی جی" رکھ لوں۔
مشیر: میراجی تو ایسا نام ہے کہ جیسے "میرا" کوئی سونے کی انگوٹھی تھی۔ اور اس کے بھبوسے میں "جی" کا نگ رکھ دیا گیا۔ جو اُس میں خوب

---

[1] فلاخن انداز: دشمن کی فوج پر پتھر پھینک کر مارنے والا۔ گوپھن چلانے والا۔

کھپا پھبا اور سجا لیکن (رستمی جی) ایسا ہے کہ جیسے انگوٹھی کے بھبوے میں کوئی انگھڑ نگ رکھ دیا گیا ہو، جو بھبوے میں نہ کھپے نہ پھبے نہ سجے۔ یہ لڑکی آپ کے لئے نہیں ہو سکتی جس کے لئے یہ ہو گی۔ اُس پر یہ فقرہ چست ہو گا۔ گوشتِ خر، "دندانِ سگ" میں نے سُنا ہے کہ آپ میرا بہن کے ہم مذہب بننے کے لئے لاہور کی نہر میاں میر کے سبز کنارے، سورج کی طرف منہ کر کے دید منتر جپا کرتے تھے۔

میراجی: جنیو بھی پہنا کرتا تھا۔ ماتھے پر رولی بھی لگی ہوئی ہوتی تھی۔ وہ کہ جیسے تم نے اب دیکھا ہے، آتش پرست ہے، گبر۔ اے کاش کوئی مجھے اُس کے چولھے کی انگاری لا دیتا، تو میں اس سے ایسی آگ جلاتا جو کبھی نہ بجھتی۔ اور اگنی پوجا کیا کرتا۔

مشیر: آپ تو سمندر کنارے جا کر اب بھی سورج کے سامنے کئے مالا جپتے ہیں۔

میراجی: مجھے اسکی عادت پڑ گئی ہے۔ دہلی میں اس لئے جمنا کنارے جایا کرتا تھا۔ پھر ایک چمک چاندنی سوداگر بچیؔ " نے یہ عادت چھڑا دی تھی۔

مشیر: میں آپ کو آگ کی وہ چنگاری لا کر دونگا، جس کی وہ اور اُس کا خاندان پرستش کرتا ہے۔

میراجی: نہیں مجھے یہ مقدس آگ درکار نہیں۔ مجھے تو اُس چولھے کی انگاری لا کر دو۔ جس چولھے پر پکایا ہوا کھانا رستمی کھاتی ہے۔

مشیر: مقدس آگ کا لانا تو شائد ممکن ہی نہ ہوتا، لیکن اُمید ہے، کہ یہ دوسری آگ لائی جا سکے گی۔ یہ بھاجیؔ میں کل سمندر گیا۔ بڑے زور

؎ بھاجی: پنجابی میں "بھائی جی" کو کہتے ہیں۔

کی ہوا چلنے لگی تھی۔ اور پانی بلبلوں اُچھل رہا تھا۔ اور آپ تھے کہ آپ نے پیڑ پہ ٹنگی ہوئی تصویر کے سامنے ماتھا زمین پر ٹیکا ہوا تھا۔

میراجی : لوگ تو پتھروں تک کو سجدہ کرتے ہیں۔ اگر میں میرابین کے سامنے سجدہ ریز ہوا تو کیا اچنبھا۔ میں تو اس خیال کا ہوں کہ ؎

اُسے رام کہوں، یا شام

ایشور کہوں یا اللہ

میرا کو ہی سب کچھ کہوں

مشیر : مگر بھاجی ؎

خدا کو چھوڑ کر بت کی پرستش یوں نہیں کرتے۔

۱۴

لڑکا مُشیر اگلے ہی دن دوپہر کے وقت نوشیرواں پوچکاں والہ کی کوٹھی پر بہانہ کر کے پہنچا کہ اُسے روزگار کی تلاش ہے۔ اور اُس نے دیکھا کہ وہی چوٹی میں سفید پھُندنا سجانے والی مُتمرد لڑکی سامنے سے گزر رہی ہے۔ اور باوجود بنسیلے[1] پن کے اس میں غضب کی جاذبیت ہے۔ وہ نہائیت خود سر معلوم ہوتی تھی۔ اگر اس میں خوشخصالی کا عنصر بھی ہوتا، تو وہ حُسن برشتہ[2]، کرن بالا اور حسن صبیح، عقمہ سے بڑھ جاتی۔ سنگلاخ ویرانہ میں ریتلے کو مچہ کھڑا ہوا بُول جس کے ہرے ہرے پات ہوں لمبے لمبے اور بے کراں سفید سفید سُول، معہ تیز زرد رنگ پھول، سرو شمشاد کو مات کر سکتا ہے۔

[1] بنسیلا پن : جنگلی پنا۔

[2] حسن برشتہ : سانولا معشوق۔

رُستمی کی آنکھوں میں کپٹ[1] بھرا ہوا تھا۔ اس کی چال نچنیوں اور رنڈیوں جیسی تھی۔ اُس نے گوٹے گریباں[2] کھولے ہوئے تھے۔ گو اس میں پارسی خون بھی تھا، کیونکہ اس کی ماں پارسن تھی۔ لیکن یہ خون اُس ناسزا میں قطعی ناپدید تھا۔ یہ اپنے گڈریئے باپ پر تھی۔ اِسی لئے وہ تمام خاندان پنج اور دشٹ سمجھی جاتی جاتی تھی۔ اسکی تعلیم اور تربیت کا کوئی بندوبست نہ کیا گیا تھا۔ اسکی ماں اِسے زچہ خانہ میں ہی چھوڑ کر کہیں چلی گئی تھی۔

رسمی کو اسٹینڈ پر کھڑے ہوئے دو تین منٹ ہی ہوئے تھے، کہ بس آ گئی۔ لیکن بس میں سوار ہونے کی بجائے اُس نے اپنا رخ کوٹھی کی طرف کیا۔ وہ اپنے کمرہ میں چلی آئی۔ اور روزگار تلاش کنندہ کو اندر ہی بلا لیا۔ اب وہاں کوئی تیسرا نہیں تھا۔ رسمی بولی! نوکری کرو گے؟"

لڑکا : کروں گا۔

رسمی : جس کام کو کہا کرو گے ؟۔

لڑکا : کروں گا۔

رسمی : سُولی پر چڑھو گے ؟۔

لڑکا : چڑھوں گا۔

رسمی : سمندر میں ڈوبو گے ؟۔

لڑکا : ڈوبوں گا

رسمی : ہوا میں اڑو گے ؟۔

لڑکا : اڑوں گا۔

رسمی : جھوٹ بولو گے ؟۔

---

[1] کپٹ : فریب

[2] گوٹے گریبان : گریبان کی گھنڈی

لڑکا : بولوں گا۔

رستمی : اب جھوٹ بول رہے ہو؟۔

لڑکا : نہیں

رستمی : تم جھوٹ بول رہے ہو۔ نہ تم سولی چڑھو گے، نہ سمندر میں ڈوبو گے، نہ ہوا میں اڑو گے۔ کیونکہ تمہارے پر نہیں ہیں۔ البتہ جھوٹ بولو گے۔ تم امتحان میں فیل ہو گئے۔ لیکن پھر بھی رکھ لیئے گئے۔

لڑکا : کام ؟

رستمی : تم میرے بتونے[1] بنو گے۔

لڑکا : سمجھا نہیں

رستمی : جب میں ناچوں، گاؤں، تو تم میرے ساتھ ناز نخرے کیا کرو گے۔ یعنی کبھی آنکھیں مٹکاؤ گے، کبھی ہاتھ لہراؤ گے، کبھی رونی صورت بناؤ گے۔ کبھی ہنسی، کبھی بیٹھو گے، کبھی اُٹھو گے خوب بھر کو مٹکو گے۔

لڑکا : ایسا تو میں نے کبھی نہیں کیا۔ میں تو ایک بادلے کا بانکا ہوں۔

رستمی : بانکے جی! بمبئی کے دفعہ آئے ہو؟

لڑکا : پہلی دفعہ آیا ہوں۔

رستمی : تو جس طرح تم یہاں آکر چل بھی رہے ہو۔ پھر بھی رہے ہو۔ سب کام ہو رہے ہیں۔ اِسی طرح بتونا بن کے بتونے کے کام کر سکو گے۔ دیکھو گویا میں گا رہی ہوں، ناچ رہی ہوں، تم اِسی طرح سے مٹکنا

---

[1] بتونا : لکھنؤ کی رقاصاؤں کے ساتھ رہنے والا وہ حسین لڑکا جو رقاصاؤں کی نقل بھی کرتا ہے اور انھی کی طرح ناز نخرے بھی۔

ٹھمکنا جس طرح میں ٹھمک مٹک رہی ہوں۔ میری نقل کرنا۔
رستمی نے لڑکے کو ٹھمک کر اور مٹک کر دکھاتے ہوئے کہا:۔
دیکھا یہ کوئی مشکل کام تھوڑا ہی ہے۔ ٹھمکو اور مٹکو۔
لڑکا:۔ ابھی نہیں۔ سیکھتے سیکھتے سیکھ جاؤں گا۔
رستمی:۔ تو ہم نے تمہیں رکھ لیا۔ تم میرے ہتو نے بنو گے۔ تمہاری رہائش
اس سامنے والے کوارٹر میں ہو گی۔ تمہاری عمر کیا ہے۔؟
لڑکا:۔ مجھے سترھواں سال لگا ہوا ہے۔
رستمی: (گاتے ہوئے اور بھاؤ بتاتے ہوئے)
؎ برس سولہ کا یا کہ سترہ کا سن
جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن
اور تمہارا نام؟۔
لڑکا: مشیر
رستمی:۔ مشیر نہیں نہیر[1]۔ میں تمہیں مشیر کبھی نہیں کہوں گی بلکہ مدھو۔ اگرچہ
یہ میری ایک ہندو سہیلی کا نام ہے۔ اچھا مدھو سہی بول میں دوبارہ
گاتی ہوں۔ تم بھی ٹھمکو اور مٹکو۔
مشیر:۔ ابھی نہیں۔ جب مجھے اس کی مشق ہو جائے گی۔ تو پھر میں ایسا کر
سکوں گا۔
رستمی: مشق ابھی سے شروع کرو۔
مشیر: ابھی تو مجھے معاف کیجئے۔ میں آپ کا نوکر ہوں۔
رستمی: تم کیسے نوکر ہو۔ جب میں نے تم سے دریافت کیا تھا کہ جس کام کو

---

[1] نہیر: کسی بیل، مثلاً کدو، لوکی، سیب، ناشپاتی وغیرہ پر آیا ہوا
جو بالکل ابتدائی حالت میں ہو۔ (اسہارن پوری دیہاتی بولی)۔

کہا کروگے "، تو تم نے کہا تھا "کروں گا"۔ تو پھر یہ بیں دلیپ کیسا؟ میں گا رہی ہوں۔ میری ہی طرح بھاؤ بتاؤ، ٹھمر کو مٹکو ے

برس سولاہ کا یا کہ سترہ کا سن

جوانی کی راتیں، مرادوں کے دن

رستمی: تو پھر بیں کیسے بجاؤ گے۔؟

مشیر: سیکھ کر بجا لوں گا۔

رستمی: اور میرے بھیتر کے پٹ کیسے کھولو گے؟

مشیر: یہ بھی کھول دونگا۔

اب رستمی ناچ ناچ کر گانے لگی۔ اُس کا روئے سخن مشیر کی طرف تھا۔

ے یہ مانا تم حسین ہو، اور تمہیں ہے حق شرارت کا
کسی کی جان پہ بن جائے شرارت یوں نہیں کرتے

کچھ اپنے حُسن کی خیرات دیدو ہم فقیروں کو
کسی سائل کو اپنے در سے رخصت یوں نہیں کرتے

تمہاری اک نظر پہ فیصلہ ہے زندگانی کا
مسیحا ہو کے بیماروں سے غفلت یوں نہیں کرتے

مُشیر مٹکنے، ٹھمکنے اور بھاؤ بتانے لگا۔ رُستمی اس نورستہ و نوخیز لڑکے کو کہے جا رہی تھی: شاباش، شاباش مدھو، خُوب خُوب دلہ دلہ۔ وہ تو اِس لڑکے پر تصدق ہوتے ہوئے کہہ رہی تھی: دربن دیبی[1] ہوں، تم

---

[1] دیبی: ایک عورت کا نام ہے۔

راہِنؔ بن جاؤ"۔

پھر رستی نے مُشیر کے لب و رخسار کی تھوڑی سی ماچا ماچیؔ کرتے ہوئے کہا: بین بجانا جانتے ہو؟

مُشیر: کبھی بجائی نہیں۔

رُستمی: سکھایا تو سیکھ لوگے؟

مُشیر: سیکھ لونگا۔

رستمی: میں بھیرویںؔ ہوں تو میرا بھیرون بنے گا، میں تیری مالسریؔ ہوں، تو میرا مالکوسؔ بنے گا؟

مُشیر: بنوں گا۔

پھر وہ لڑکے کو دیکھتے ہوئے گانے لگی ؎

دور رہ کر نہ کرو بات قریب آجاؤ
ایک مدت سے تمنا تھی تمہیں چھونے کی
آج بس میں نہیں جذبات قریب آجاؤ
اسقدر ہم سے جھجکنے کی ضرورت کیا ہے
زندگی بھر کا جو ہے ساتھ قریب آجاؤ
دور رہ کر نہ کرو بات قریب آجاؤ

تو یوں یہ وقیعؔ لڑکا وقیحؔ بنتا جا رہا تھا۔ اور رستمی تو شروع ہی سے

۱؎ راہِن: یہ دیس پر عاشق تھا۔
۲؎ ماچا: بوسہ، ماچا ماچی، بوسہ بازی۔
۳؎ بھیرویں: (مؤنث) ایک راگنی ۴؎ مالسری: ایک راگنی
۵؎ وقیع: باعزت ۶؎ وقیح: بے شرم
۷؎ مالکوس: ایک راگ

دیتی تھی ۔

پھر اس نابکار نااہل و دغلی[1]، ترساچی[2] نے الماری کے پیٹ کھولے جس میں مئے و سبو سجے ہوئے تھے ۔ اس نے ریحانی[3] کی ایک بوتل اٹھاتے ہوئے کہا: "پیو اور پلاؤ۔" لڑکا رستمی کی صورت کو دیکھنے لگا۔ وہ پھر بولی: "تم مجھے دیکھو میں تمہیں دیکھتی ہوں، تم مجھے چومو، میں تمہیں چومتی ہوں۔" اب اُس نے مشیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈلتے ہوئے بڑی ترنگ سے گایا ؎

پہلے تو میں نے اِدھر اور اُدھر دیکھا ہے
جب کہیں جا کے تمہیں ایک نظر دیکھا ہے

پھر اس لڑکی نے مشیر کے رُخسار شدّت سے چومنے شروع کر دیئے اُس نے لڑکے کو سربہ مہر دیکھا تو وہ سماچہ[4] اٹھا کر اپنی نوک ہائے پستان لڑکے کے ہونٹوں سے ملنے لگی ۔ مشیر اب بھی نہ پسیجا ۔ تو وہ بولی: "میں نے تجھے کتنے پیار کئے ہیں مگر تو نے مجھے جی سے ایک پیار بھی نہ کیا ۔ کیا تیری نس[5] مری ہوئی ہیں اور تو کافور خوار[6] ہے ۔"

مشیر: میرا آج تک کسی سے ایسا سابقہ ہی نہیں پڑا ۔ پھر رستمی نے ریحانی کا ایک جام خود پیا اور دوسرے جام کی مشیر کو پیش کش کی ۔ وہ اِسے منہ

---

[1] دغلی : دغا کرنے والا
[2] ترساچی : آتش پرست لڑکی ۔
[3] ریحانی : خوشبو دار میٹھی شراب ۔
[4] سماچہ : انگیا
[5] نس مری ہوئی ہونا : نامردی ہونا
[6] کافور خوار : نامرد

نہیں لگا رہا تھا۔ وہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں غصہ سے مٹکاتے ہوئے گویا ہوئی :۔

"پی"۔

مشیر : کبھی نہیں پی۔

رستمی : پانی تو پیا ہے ؟۔ روز نہیں پیتا ؟

مشیر : پیتا ہوں

رستمی : اِسی طرح سے اسے بھی پی لے۔

مشیر : میں نہیں پیوں گا۔

رستمی : یہ تو شربت ہے۔ پی لے۔

مشیر : اِس بوتل پہ شراب لکھا ہے۔

رستمی : شراب کی بوتل میں شربت ہے۔

مشیر : میں نہیں پیوں گا۔

رستمی : مصافحہ تو کر سکتا ہے۔ ہاتھ بڑھا، ہاتھ ملا۔

مشیر نے اپنا ہاتھ لاچاری کے ساتھ رستمی کے ہاتھ میں رکھ دیا۔ وہ پھر بولی "یہ کیا ؟۔ کیا تیرے ہاتھ میں جان نہیں ؟۔ میرا ہاتھ زور سے بھینچ۔ جو کچھ مزا بھی آئے۔ اچھا یہ تو ویسا ہی بے حرکت ہو رہا ہے"۔

(اب رستمی نے دست بازی میں مشیر کا ہاتھ اس زور سے دبایا۔ کہ اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ بلبلا اٹھا اور اُس نے رُوآنسا[1] ہو کر صورت بھی بگاڑ لی)۔

رستمی : جب چھوڑوں گی جو تو ایک لفظ کے معنی بتائے۔

---

[1] رُوآنسا : روتا ہوا۔

مشیر : بتاوں گا، جو آتے ہونگے۔
رستمی : مالش گری[1] کسے کہتے ہیں ؟
مشیر : یہ تو میں نہیں جانتا۔
رستمی : اس کے معنی عشیقہ[2] کی بوسہ بازی کے ہیں۔ خزات کے معنی تو آتے ہونگے ؟

مشیر : نہیں۔
رستمی : اس کے معنی بین بجانے کے ہیں۔ میرا کہنا مانے گا ؟
مشیر : مانوں گا۔
رستمی : پہلے میں نے تجھے نو آموز سمجھ کر ریحانی پیش کی تھی۔ جو خوشبودار میٹھی شراب ہوتی ہے۔ اب میں تجھے یاقوت[3] رواں پلاؤں گی۔ پی اور مالش گیری کر۔ ہاتھ جبھی چھوڑا جائے گا۔ میں پہاڑی گدّہ رہیئے کی بیٹی ہوں۔ تو مجھ سے چھوٹ کر کہیں نہیں جاسکتا۔ میں تیرا قوام[4] نکال کر چھوڑ دوں گی۔ مڈھو، مڈھو، مڈھو، ارے مجھے چوم۔ پہلے ہونٹھ پھر گال اور آنکھیں بھی۔ ارے جنگل کے مور میرے جلتے ہوئے ہونٹھوں کے ارمان نکال دے۔ ارے مجھ میں سما جا۔ لا پہلے میں تیری بانچھیں چوموں، ہونٹ چوموں گال اور گلا چوموں۔ آئے ہائے تو تو میری باگیسری[5] ہے۔

---

[1] مالش گری : بوسہ بازی۔ [2] حسین عورت
[3] یاقوتِ رواں : سرخ شراب۔
[4] قوام : ست۔
[5] باگیسری : ایک راگنی کا نام۔

اب مشیر نے بافوت رواں بھی پی لی - اور مجبوری کے ساتھ رستمی سے بوسہ بازی بھی کی - پھر رستمی نے حکم دیا :- لُوت[1] ہو جا ، میں بھی لُوت ہو جاتی ہوں - میں تیری کھیچیاں[2] بھرتی ہوں - تو میری بھر" مُشیر نے رستمی کی یہ خواہش بھی پوری کر دی - اب وہ دونوں بالکل برہنہ تھے - اس کے بعد جو ہوا بہت برا ہوا - یعنی انضمام[3] - لڑکا رستمی سے کچھ لطف نہیں اٹھا رہا تھا - جبکہ لڑکی اس بہرہ دری سے گوش ناگوش مزدں میں ڈوبی ہوئی تھی -

اب یہ تراجع[4] و ترادیف[5] ہر وقت کا حیلہ ہو گیا تھا - اور بمبئی کی اس چودھر[6] اور گبرو گبز[8] لڑکی نے اس لاہوری لڑکے سے اتنی ترطیب حاصل کی تھی کہ وہ خشک ہو کر سکڑ سا گیا تھا - اور اُسکا نچلا ہونٹ بیں بجاتے بجاتے سوج گیا تھا -

موجودہ فوری انسلاک[9] کے بعد رستمی نے مشیر کو اپنی بہیمیت کے

---

[1] لوت : ننگا

[2] کھیچی : سینہ سے لگانا

[3] انضمام : دو کا ملنا

[4] تراجع : آپس میں جڑنا

[5] ترادیف : ایک دوسرے کے پیچھے سوار ہونا -

[6] چودھر : قوی

[7] گبر : آتش پرست [8] گبز : فربہ

[9] انسلاک : پرو دیا جانا - لڑیا یا جانا -

صلے میں سو روپے دیئے اور کہا: "تیری تنخواہ دو سو روپیہ ماہوار مقرر کر دی گئی ہے۔ یہ سو روپے پیشگی دے رہی ہوں۔"
مشیر روپے لے کر کپڑے پہننے لگا۔ تو رستمی کپڑے چھوٹ کر اپنے دونوں بھاری جنگھے[1] مشیر کے نسبتاً ہلکے جنگھوں پر لے آئی۔ اس لڑکے کا چھوڑادا[2] اس پر ان پر ہوا کہ وہ دوسری بار کم و بیش کے لئے تیار ہو جائے۔
مشیر نے صرف شہری زندگی دیکھی تھی، اور یہیں کے سرو شمشاد اسکی نظر میں تھے۔ اسلئے وہ لق و دق ریگستان کے چنچلہ[3] پر کھڑی ہوئی اس کیکر کے گن کیسے گا سکتا تھا جس کے ہرے ہرے پتے بادِ بیاباں میں لہرائیں، نیز اس کے بسنتی گلاب سے بھی زیادہ سجیلے زرد پھولوں اور لمبے لمبے سبے کراں سفید کانٹوں نے اُسکی بہاروں میں بہت اضافہ کیا ہوا ہو۔
علاوہ ازیں مشیر ہیر نہ سہی، لیکن وہ تو صرف سترہ سالہ تھا۔ یعنی اسکی دال ابھی ابھی جھڑی تھی۔ انسلاک میں اس ابھی ابھی بلوغ کو پہنچے ہوئے لڑکے کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ اُس نے اس سے پہلے انسلاک سے کچھ لطف بھی اٹھایا ہو۔ لیکن رستمی تو اُسے اتنا ناکوں ناک بھر رہی تھی کہ جس سے وہ بہت جلد اور بہت اُکتا گیا تھا۔ بہیمانہ زفتسار[4] میں ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ جب کہ دُشت قطامہ اس کے ساتھ جفت بازی سے کبھی سیر نہ ہوتی

---

[1] جنگھا: ران، جانگھ

[2] چھوڑادا: جھٹکارا۔

[3] چنچلہ: ڈھالۃ۔ ارٹیلہ۔

[4] زفتسار: زبردستی

تھی۔ اُس چھپر کھٹ پر جہاں رستمی اس لڑکے کو پڑا ئے رکھتی تھی اس کا خاص طور سے بنوایا ہوا ایک ہی لمبا تکیہ ہوتا تھا جس پر یہ دونوں اپنے سر رکھتے تھے۔ اور یہی لمبا تکیہ رستمی کی کمر کے نیچے۔

رستمی اب ڈھابوں میں ناچنے گانے جانے کی بجائے ہر وقت مشیر لمس[1] کے لابھ[2] اُٹھا رہی تھی۔ اور فی الحال اُس نے اِس لڑکے کو بجائے بنونا بنانے کے بارہ بنایا ہوا تھا۔ اور مشیر کی خواہش وہاں سے جلد از جلد چمپٹ ہو جانے کی تھی۔ گو اُسے خاص طور پر لوزینہ[3] اور لُوٹ پُوٹ[4] میسر ہو رہے تھے۔ اُسے خاص طور پر شرابِ پشت[5] دار پلائی جا رہی تھی۔ لیکن انسلاک[6] کی زیادتی کے سبب وہ مہندوم[7] ومہزدل[8]، جف[9] اور جفاف[10] ہوا جا رہا تھا۔

رستمی نے اُسکا نیا پن استری، خشخنہ[11] وجزالت[12] ختم کر کے رکھ دئے تھے۔ وُہ اُسے تھوڑی دیر کو بھی اکیلا نہ چھوڑتی تھی۔ رستمی نے درزی

---

[1] لمس: جماع۔ چھُونا [2] لابھ: فائدہ

[3] لوزینہ: بادام دار حلوہ۔

[4] لُوٹ پُوٹ: چٹخارے دار کھانے۔

[5] شرابِ پست دار: باہ بڑھانے والی شراب۔

[6] انسلاک:

[7] مہندوم: ہارا ہوا۔ شکست خوردہ [8] مہزدل: ناتواں۔

[9] جف: مُرجھایا ہُوا۔

[10] جفاف: خشک

[11] خشخنہ:

[12] جزالت:

سے گھر پر ہی ناپ دلوا کر اس کے نفیس کپڑے سِلوا دئے تھے۔ مشیر اس مجالست[1] سے نکلنے کی کوشش میں ضرور تھا، لیکن اُسکے چولہے کی آگ لے کر تاکہ صحابت نباہتے ہوئے میراجی سے کِیا ہوا وعدہ وفا ہو سکے۔ اور میراجی کو یہ دغدغہ لگ گیا تھا، کہ اُسکا بھی غالب کے نامہ بر جیسا حال نہ ہو گیا ہو۔

دراصل مشیر اس لڑکی کو نہیں برت رہا تھا، بلکہ وہ اِسے برت رہی تھی۔ اور اتنا برت رہی تھی کہ مشیر کا بدن چور چور ہو جاتا تھا۔ اِس لڑکے کی تو یہاں یہ حالت ہو گئی تھی کہ جیسے وہ چھری تلے دام لے رہا ہو۔

رستمی مشیر سے اکثر پنجاب کے محوالہدیث[2] مثلاً ہیر رانجھا، سسی پُنوں کے قصّے سنا کرتی تھی۔ اِنہیں سُنتے سُنتے ادھ بیچ میں ہی اُس پر شیطان سوار ہو جاتا تھا۔ اور اس سے پہلے کہ قصّہ ختم ہو، وہ مشیر کو شکنجہ میں کھینچ لیتی تھی۔ اُسکے مُنہ سے بار بار یہ بول نکلا کرتے تھے: "یہ کام بادن تولے پاؤ رتی کرے"

رستمی نے ایک چکاوک[3] کا جوڑا پالا ہوا تھا۔ مشیر کے بعد جو یہ کسی پر مائل تھی تو وہ یہ پرندے تھے۔ گو وہ گویا اِس لڑکے کی ران سے ران باندھے رہتی تھی، لیکن اُس چھنار[4] کو تھوڑا سا وقت چکاوک کے جوڑے کی دیکھ بھال میں بھی گزارنا پڑتا تھا۔ مشیر کو رستمی کی یہ لگن معلوم ہو گئی تھی۔ اِس لئے اُس نے بظاہر یوں ہی کھیل میں لیکن اصل میں دغل[5] کے سبب پنجرہ

---

[1] مجالست :

[2] محوالہدیث : قصّے کہانیاں ۔

[3] چکاوک : ایک خوش الحان پرندہ ۔ چنڈول ۔

[4] چھنار : فاحشہ عورت [5] دغل : فریب ۔

کی کھڑکی کھول دی۔ اب دونوں چکاوک اڑ گئے تھے۔

چونکہ پرندوں کا جوڑا اُس کوارٹر نما گھر کے باہر کیکر کے ضخام اور پھیلواں ببول پر جا بیٹھا تھا۔ اس لئے رستمی بحالتِ سراسیمگی اُسی دروازہ سے، جسے وہ مقفل رکھا کرتی تھی، کہ اُسکا دِلارا باہر نہ نکل جائے، آپ باہر چلی گئی۔ اب پٹ کھلے ہوئے تھے۔ مشیر کو موقع مِل گیا تھا۔ اس نے تھوڑی سی آگ چولھے سے کرچھے میں اٹھائی اور طامۂ[1] کبریٰ طرارہ بھرتا ہوا انگیٹھی بھاگ نکلا۔ وہ ورطہ[2] کہ جس میں رستمی مشیر کو رکھ رہی تھی، اب ورطہ نہیں رہا تھا۔

لیکن باہر ببول تلے رستمی بھی کھڑی ہوئی پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔ اُس نے مُشیر کو کرچھے میں آگ لے جاتے ہوئے پایا۔ تو اُسکی طرف لپکی۔ مشیر اس زور سے بھاگ رہا تھا کہ رستمی اُسے پکڑ نہ سکی۔

میراجی جو اکثر دوربین لگا کر اس لئے بیٹھا رہتا تھا کہ اپنے ہمبانہ[3] کو آگ لاتا ہوا دیکھے۔ آج ببول کے پاس یہ ماجرا دیکھ کر سخت رنجیدہ ہوا۔ اس نے تو ایک انگیٹھی اور کوئلوں کی بوریاں بھی خریدی ہوئی تھیں۔ تاکہ مشیر کی لائی آگ حتی المقدور جلائے رکھے۔ اور پوجے۔ لیکن اس ہڑآدۂ[4] ہما ہی میں کرچھا گر کر انگاریاں یہیں تتر بتر ہو گئی تھیں۔ کہ اُن کا چگنا ناممکن تھا۔ اور پھر جب دشمن یورش کر رہا ہو تو مال و متاع کون بچا سکتا ہے۔

مشیر نے میراجی کو اپنی داستانِ قید سنائی، تو سننے والا رشک میں

---

[1] طامہ : کبریٰ : قیامت

[2] ورطہ : ایسا مقام کہ جہاں سے نکلنے کے راستے مسدود ہوں۔

[3] ہمبانہ : ساتھی۔

[4] ہڑآدۂ : شور و غل

ڈوب گیا تھا۔ یہ مثال ایسی تھی کہ جو چاہے اُسے تو نہ ملے، اور جو نہ چاہے اُسے ملے۔

میراجی تو چاہتا تھا کہ اس لڑکے کو رستمی پر دسترس حاصل کرنے کے لئے اسطرح استعمال کرے جسطرح شکاری جنگلی تیتر پکڑنے کے لئے جال لگاتا ہے، اور جب جنگلی تیتر اس کے تیتر کی آواز پر آتے ہیں، تو جال سے نہیں نکل سکتے۔ لیکن مشیر اتنا سہما ہؤا تھا، کہ اُسے رستمی کے بنگلہ کی طرف نظر تک اٹھانی دوبھر تھی۔

۴۴

اب چند روز تک تو رُستمی کو مشیر سے بچھڑنے کا اتنا صدمہ رہا۔ کہ وہ گھر سے باہر تک نہ نکلی۔ لیکن بعد میں اُس نے ڈھابوں میں جاکر پھر ناچنا گانا شروع کر دیا۔ میراجی کی دُوربین اب بھی کام دے رہی تھی، کیونکہ جب اسے اور مشیر کو پتہ لگ جاتا کہ رستمی بس میں سوار ہو کر شہر جا چکی۔ تو جبھی یہ شہر جانے کے لئے اڈے پر پہنچتے۔ میراجی کی پونجی ختم ہو چکی تھی۔ اُس کا کوئی روزگار بھی نہ تھا۔ اس لئے لاہور کے یہ دونوں باشندے نوکری کی تلاش میں نکلنے لگے۔ اب مشیر کا پیسہ کام آ رہا تھا۔

ویسے یہ دونوں ہی رستمی سے خوف زدہ تھے۔ مشیر زیادہ خوف زدہ تھا۔ کیونکہ اس کے دل میں اس مہلکہ[1] کی بہت ڈری بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں وہ آگ لینے گیا تھا۔ لیکن لا نہیں سکا تھا۔

---

[1] مہلکہ : ہلاکت

یہ دونوں تمام دن بمبئی میں ہرزہ گردی[1] کرتے رہتے تھے۔ کئی دفعہ اِن کے پاس اتنا بھی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کھانا کھا سکتے۔

مشیر کرشن چندر کے بالائی ہال میں صرف چھ سات ماہ لنگر ڈال سکا تھا، کہ بٹوارے کے بگل بجنے لگے تھے۔ ہندوستان کے دوسرے حصّوں کی طرح بمبئی شہر بھی بلوؤں کی لپیٹ میں آگیا تھا۔ اور مُشیر نے لاہور واپس جانے کی ٹھان لی تھی۔ میراجی یہ معلوم کر کے ازحد دل برداشتہ ہوا تھا پھر جس دن اس نے اپنے ساتھی کو ٹرین میں سوار کرانے کی تیاری کی، اور اُس کے ساتھ بس اسٹینڈ پر پہنچا، تو قضارا رستی بھی وہاں آگئی۔ اس نے لڑکے کو پکڑنا چاہا۔ جبھی ایک سواریوں سے بھری ہوئی بس آگئی۔ اس میں عدم گنجائش کے سبب کوئی بھی سوار نہیں سکتا تھا۔ اب رُستی تو مُشیر کی طرف بھاگ رہی تھی، اور براعت[2] یافتہ مُشیر ڈر کے مارے بس کے دروازے سے لٹک گیا تھا۔ بس چل پڑی تھی اور رستی کے چلّانے کے باوجود کہ بس ٹھہرائی جائے، کنڈکٹر اُس کے چلّانے پر ذرا بھی دھیان نہیں دے رہا تھا۔

اب اس تڑ پڑی[3] کے بعد رُستی، میراجی کو گھور رہی تھی، اور وہ اِس کی خوش مگنی فدامت[4] دیکھ کر کرشن چندر کی کوٹھی کی طرف لپک رہا تھا۔ رستی اُس کا پیچھا کر رہی تھی۔ جب میراجی دوڑنے لگا تو یہ اُسے پکڑنے کے لئے بھاگی۔ پھر اس نے میراجی کے دونوں پہنچے اس طرح اپنے قابو میں کر لئے کہ جیسے ڈھبو لنگور کسی ناتواں بندر کو پکڑ لے۔ وہ میراجی سے دریافت

---

[1] ہرزہ گردی: آوارہ پھرنا۔

[2] براعت: چھٹکارا۔

[3] تڑ پڑی: ہنگامہ۔

[4] فدامت: ترش مزاجی۔

کر رہی تھی: "ارے چلنچو[1] یہ لڑکا کون تھا؟"
میراجی: - لاہور کا رہنے والا اور میرا وطنی -
رستی: تو نے اُس عمر عیّار کو کیوں جانے دیا؟ ارے باؤرے وہ تو تیرا
بالکا تھا - اور تو اُس کا باوا ہے -
میراجی: وہ اپنے گھر جا رہا تھا - میں اُسے کیسے روکتا -
رستی: ارے بدھنے[2]، جیسے میں نے تجھے روکا - تو کہاں رہتا ہے؟ -
میراجی: (کرشن چندر کی کوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) وہاں!
رستی: (تحکمانہ انداز میں) اب میں تجھے وہاں نہیں جانے دوں گی - میرے ساتھ
چل اور اس لڑکے کو ڈھونڈ - وہ اسٹیشن پر گیا ہوگا -

میراجی میں اتنا یارا نہیں تھا کہ رستی کی بات کاٹ سکے - یہ دونوں بس میں سوار ہو کر وکٹوریہ ٹرمنس پہنچے - رستی نے اپنا اور میراجی کا پلیٹ فارم ٹکٹ خریدا - یہ پلیٹ فارم پر پہنچے ہی تھے، کہ پونا جانے والی ٹرین چل پڑی اور انہوں نے دیکھا کہ مشیر بھاگا بھاگ اس میں سوار ہو رہا ہے - اس کے ہاتھ میں میراجی کے ایک طویل افسانہ کا وہ مسودہ تھا جسے لاہور کے رسالہ "ادب لطیف" پہنچانے کی اس نے ذمہ داری لی ہوئی تھی - لیکن زمانہ کی دستِ برد کے سبب یہ کبھی نہیں چھپ سکا، حالانکہ میراجی کی خواہش تھی کہ یہ ضرور چھپے کیونکہ اس میں اُس نے اپنی عشق بازیوں کی بپتائیں لکھی ہوئی تھیں -

میراجی اور رستی چلتی ٹرین کو لاچار اور مایوسانہ کھڑے ہوئے دیکھ رہے تھے - پھر رستی میراجی کو لئے ہوئے اپنے نانا کی کوٹھی پہنچی، الماری

---

[1] چلنچو: میلا کچیلا -
[2] بدھنا: بے تلی کا بے ہنگم لوٹا -

کے پیٹ کھولے۔ اُس نے غم غلط کرنے کے لئے خود بھی بہت سی شراب پی، اور میراجی کو بھی پلائی، اور غصّہ سے بھرے ہوئے کہا: "اب میں تجھے کبھی یہاں نہ دیکھوں۔ تجھے دیکھ کر مجھے وہ لڑکا یاد آیا کرے گا۔ اچھا اب لمبا ہو۔" پھر رستی نے میراجی کو دھکے دیتے ہوئے ایسی گردنی دی تھی کہ وہ اوندھے منہ گرتے بچا تھا۔

اس کے بعد رستی نے اپنے لئے شُشتک[1] بنوالیا تھا۔ اور ہر کی ایک قدِ آدم تصویر بھی، جس میں اُسے بحالتِ برہنگی آمادۂ شست[2] زنی دکھایا گیا تھا۔ وہ اپنی ہوس اس مرقع کو سامنے رکھتے ہوئے شُشتک کے ذریعہ پوری کرنے لگی تھی۔

جو بدسلوکی اس آدھی آتش پرست گردن کش لڑکی نے میراجی سے کی تھی وہ اس سے کیا اُمید باندھ سکتا تھا۔ وہ شراب جو اُسے رستی نے پلائی، معلوم نہیں اس میں کیا مادہ ہوگا۔ اُسے گرگری[3] میں سردی چڑھ گئی تھی۔ وہ کرشن چندر کی کوٹھی بھیگتا اٹھتا پہنچا تھا۔ اُسے سخت حرارت ہوگئی تھی۔ اسکا خبر گیراں صرف مشیر ہو سکتا تھا۔ وہ دارد کے لئے اُسکی جیب خالی تھی۔ کیونکہ وہ تو سائل بکف[4] ہو چکا تھا۔ وہ اپنے کھلے ہوئے بستر میں جاکر لیٹ گیا۔ گرمی خوب پڑ رہی تھی لیکن پنکھے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ اُسے پسینوں پہ پسینے آرہے تھے۔ وہ دو دن تک یونہی پڑا رہا۔ اُسے کوئی خوراک نہیں مل رہی تھی۔

اُسے تپ دائی کی بیماری لگ گئی تھی جسے طبّی اصطلاح میں اُم ملدم[5] کہتے ہیں۔

---

[1] شُشتک: چرمی آلۂ مرد، برائے مٹانے ہوسِ زن۔
[2] شست: مضراب۔ نشتر [3] گرگری: سردی کا بخار
[4] سائل بکف: پیالہ پھیلا کر مانگنے والا۔
[5] اُم ملدم: ہمیشہ چڑھا رہنے والا بخار۔

میراجی نے کرشن چندر کو بلایا۔ جس نے اُسے ڈاکٹر سے دوا بھی منگا دی اور اپنے بھائی مہندر ناتھ کے ہاتھ کھانا بھی بھیجا۔ میراجی نے اپنے لکھنوی دوست سے ملنے کی خواہش ظاہر کی، جو کچھ عرصہ لکھنؤ میں نوکری کر کے بمبئی واپس آگیا تھا۔ کرشن چندر نے ٹیکسی منگائی اور اُسے بلانے چلا گیا۔ مگر اُس نے کچھ دن کام کر کے چھٹی لی ہوئی تھی، اور پھر اپنے گھر لکھنؤ گیا ہوا تھا۔

میراجی کی حالت کافی بگڑ گئی۔ تو کرشن چندر نے اُسے ایڈورڈ میموریل ہسپتال میں داخل کرا دیا۔ کرشن چندر نے میراجی کی اعانت میں کوئی کمی نہیں کی تھی۔ وہ بیمار کے پاس اکثر آتا رہتا تھا۔ میراجی کو خون کی ضرورت ہوئی تو کرشن چندر کے بھائی، مہندر ناتھ، نے اپنا خون دیا تھا۔

۴۵

ایک دوست کرشن چندر اور میراجی کا لکھنوی دوست ہسپتال آئے۔ میراجی کروٹ لئے ہوئے، میز پر رکھی ہوئی حُسن بنگالن کی اُسی تصویر کو دیکھتے ہوئے جو اُس نے ٹمپل روڈ۔ لاہور والے، مسٹر کلیم کے گروپ فوٹو سے علیحدہ کر کے انلارج کرائی تھی، یہ شعر پڑھ رہا تھا۔

؎ اس طرف بھی کرم اے رشکِ مسیحا کرنا
کہ تمہیں آتا ہے بیمار کو اچھا کرنا

لکھنوی دوست اُس کے لئے اسسٹنٹ پروفیسر مِس میرا سین کا خط بھی لایا تھا، جس میں میراجی کو لکھنؤ آنے کی دعوت دی ہوئی تھی، اور لکھا تھا کہ میراجی کے ترجمہ عمر خیام سے جو اسنے فٹز جیرالڈ کی ورشن (version) سے کیا ہے، بہت متاثر ہوئی ہے۔ اور اس سے بھی کہ اس نے اپنا آبائی نام چھوڑ کر اس کی نسبت سے میراجی نام اختیار کیا ہے۔

اس خط سے میراجی کو انتہائی خوشی ہوئی تھی۔ اس نے کچھ سنبھالا سا لے لیا تھا۔ اسکی بیماری کچھ دیر کو کم ہو گئی تھی۔ لیکن اُس شقا[1] و شقاوت[2] کو یہ منظور نہیں تھا، جو شروع سے اُس پر مسلط تھی، کہ میراجی کا میرا سین سے ملن ہو سکے۔

اُسکی دنیا میں کبھی بادِ شرط کا ایک جھونکا تک نہیں آیا تھا۔ اُسکی چار مستند پریم کہانیاں تھیں، پہلی میرا سین کی، دوسری عصمہ کی، تیسری کرن بالا کی اور چوتھی رستمی کی۔ پہلی پریم کہانی کو، جسکا افتتاح لاہور کی یونیورسٹی گراؤنڈ میں ہوا تھا، شجر الکلیم[3] کہہ سکتے تھے۔ بالآخر اسکی جیون کتھا بمبئی کے شفا خانہ میں ختم ہو رہی تھی۔ اور لاہور والوں کو اس طالحہ[4] کا علم کافی عرصہ بعد ہوا تھا۔ غربت میں کسی نے اسکی فاتحہ درود تک نہ کی تھی۔

حضرت علامہ اقبال کے لبوں پر آخری یہ بول تھے ؎

نسیمے از حجاز آید نہ آید
سرودِ رفتہ باز آید نہ آید

بسر شد زندگیٔ ایں فقیرے
دگر دانائے راز آید نہ آید

میراجی کے ہونٹوں پر فانیؔ کا یہ شعر ہونا چاہیے تھا ؎

مآلِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اُٹھی ہے شمعِ زندگانی دیکھتے جاؤ

وہ کبھی ساعاتِ کارساز کا منتظر نہیں ہوا تھا۔ نہ وہ کبھی آئی تھیں۔ اُس

---

[1] شقا: بدقسمتی۔
[2] شقاوت: ظلم۔
[3] شجر الکلیم: اس درخت کے نیچے حضرت موسیٰؑ کو خدا کی جھلک سی دکھائی تھی
[4] طالحہ: مہلک واقعہ۔

نے صرف ایک مرتبہ ہپ ہپ ہرّا کے نعرے لگائے تھے۔ ورنہ اُس نے کسی کے خیر مقدم کے لئے کبھی طاق ہائے نصرت کا اہتمام نہیں کیا تھا۔ نہ کسی نے اُسکے لئے پشپنجلی[1] تیار کی تھی۔ وہ کسی تنکے کے سہارے بغیر بہا جاتا رہا تھا۔ وہ صرف ایک دفعہ خرمست بن کر عقمہ کا فوقانی[2] اور تحتانی[3] بنا تھا۔ اور وہ بھی خرمست بن کر اُسکی فوقانی و تحتانی بنی تھی۔ بس یہی مسئلہ وسلی[4] اسکی زندگی کا پہلا اور آخری معراج تھا۔ زمانہ کے لدوکوب نے اُسے ابھرنے کی کبھی مہلت نہیں دی تھی۔

وہ مینہ سے خالی ایک لکۂ ابرِ سفید تھا۔ جسے تُند ہوائیں کہیں کا کہیں اُڑائے پھر رہی تھیں۔ کبھی وہ لاہور میں تھا، کبھی دہلی میں، اور آخر اسی تندو تیز نے بمبئی لے جاکر اُسکا تار و پود بالکل ہی بکھیر دیا تھا۔

زندگی کے خشنک قمار[5] پر اُسے ہمیشہ شکست ہی ہوتی رہی تھی۔ وہ ہمیشہ خشوف[6] زدہ رہا تھا۔

میرا کے بعد کی پریم کہانیوں کو صرف ضمنیوں کا رتبہ دیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ ان میں پہلی محبت جیسا شدومد نہیں تھا۔ میرا کی محبت بدبختی کی شب دیجور میں ایسا گوہر شبِ چراغ تھا۔ کہ باقی جواہر اُس کے سامنے ہمیشہ ماند رہے۔ میرا کی مسابقت[7] مسلّم تھی۔ وہ ہر چہرہ اور ہر نقشہ میں میرا کی مشابہت کا متلاشی تھا

---

[1] پشپنجلی: پھولوں کا تحفہ پیش کرنا۔

[2] فوقانی: اوپر ہونا۔

[3] تحتانی: نیچے ہونا۔

[4] مسلا وسلی: مسلا، مسلنے سے متعلق یعنی مسلنا، وسلی، وسلی بنانے سے متعلق۔

[5] خشنک قمار: تختہ یا کپڑا جس پر جوا کھیلتے ہیں۔

[6] خشوف: سورج گرہن۔

اس کے دل سے میرا سین کی خواستگاری کبھی کم نہیں ہوئی تھی۔ حالانکہ میرا کے ساتھ اُس کا یارانہ پل دو پل کے لئے بھی نہیں ہوا تھا۔

(۴۶)

میراجی کو کسی شرارہ سے، خواہ وہ دہلی کی عقیمہ ہو، مسز یادو، کرن مالا ہو یا بمبئی کی رستمی، میرا کے برابر شغف نہیں ہوا تھا۔ اُسکی پہلی محبت سرمدی تھی۔ اور بعد کی محض ذیلی عشق بازیاں، جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے۔

۱۔ یہ سعادت توفیق دو فرہاد تک تو نصیب نہیں ہوئی۔

میراجی تو اِس قابل تھا کہ اس کا مُرقعہ عشاق کی چتر شالہ میں صدجگہ سجایا جاتا، میرا عجائب گھروں میں اس کے پورے اور نصف مجسمے رکھے جاتے، ببٹرس والے ڈانٹے، میری گوڈوں والے شیلے، اور فینی براؤن والے جان کیٹس نے اپنی محبوباؤں کے نام اختیار نہ کئے

۲۔ میراجی کے لئے بھی دُعا مانگی بھل منسات۔ اس سے معلوم ہوا کہ میرا جی کو حضرت سرورِ کائنات کا کتنا احترام تھا۔ اور یہ کہاں تک ایسا ہے۔ کہ گو میراجی میں قدس و برگزیدگی تو نہ تھی۔ مگر خدائے بخشندہ اُسے بخش دے۔

پاکستان بنا تو دِل بافتہ دل تفتہ میراجی بمبئی میں تھا۔ اور اسکی بڑی تمنا تھی کہ وہ اس نئی مملکت میں آئے جہاں اس کے خیال میں اب تک بنگالی بلڈنگ والی رہتی تھی۔ وہ اُسے نہ دیکھ سکے تو اُسکی رنگارنگ ساڑھیوں کو تو سوکھتے ہوئے دیکھ کر میراجی کے دلدار، اور ہندوانی خوشبوؤں والے بنڈے کی نہفگیوں کی بابت سوچ سکے۔ مگر وہ لاہور نہ آسکا۔ البتہ میرا جی کے ایک واقف نے اس بنگالی کو لاہور جاء دگرلی لاہور ریلوے اسٹیشن پر کہیں سے آتے اک ادائے مستانہ سر سے پاؤں تک چھپائے ہوئے دیکھا۔

میراکا یہ حال تھا کہ اک اداۓ پر چھائی ہوئی - اُسکے کجرے کجرے نینوں کو رنگین چشمے میں چھپایا ہوا تھا- اور گوری گوری باہوں میں رنگین چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں -اسٹیشن پر تمام ہی میراکو دیکھ رہے تھے ، راہِ سلامی جس طرح ڈالتے ہوں - اسی طرح سے میراجی کو بھی میراسین کی راہ سلامی نصیب نہ ہوئی-

۲ - علاوہ ازیں یوسف ظفر نے میراجی کی ایک نظم " خدا " بھی پڑھی ہوئی تھی- جس کے بعد میں میرا رسالہ حوالوں کے طبع کیا تھا اور نئے ادارے نے ۱۹۴۶ء کی نظموں کے انتخاب میں صفحہ ۶۲ پر شائع کیا تھا- جس میں میراجی نے رَبِّ ذوالجلال کو " رُوحِ ابد" قرار دیا- یہ نظم فنی اعتبار سے کتنی ہی بلند پایہ ہو، لیکن "رُوحِ ابد" ایک گستاخانہ تسبیح ہے- مگر یوسف ظفر نے سوچا کہ ایک مثل مشہور ہے کہ چاہنے والا چہیتے کے چاہنے والے کو بھی چاہے -

میراجی کی پہلی محبت سرمدی تھی اور بعد کی محض ذہنی عشق بازیاں جن کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ

بے سبب کب تھا کہ کچھ دیر محوِ عبیر ہم
سب حسینوں پہ ہوا دھوکا تیری تصویر کا

یا دارا شکوہ کے الفاظ میں

ہر لحظہ روۓ خویش نماید بہ صورتے
فارغ بہ جلوہ ہاۓ بہ تکرار آمدہ

لیکن یہ اُسکی کوشش ایسی تھی کہ جیسے وہ تاروں بھرے آکاش میں اپنا کھویا ہوا تارا ڈھونڈ رہا ہو-

میرا واقعی چھلاگن تھی ،اور رسنی ٹلانچن سی تھی - کرن بالا حسن نمکین لیکن ان کا چہرہ میراجیسا مقدس آشنا کہاں تھا- میرا گاۓ تھی تو دو غلی پارسن گھگیر لے - پہلی سُبک و سہل تھی، تو دوسری بھاری اور گراں جان سلیطہ

میرا فخارہ[1] بھی، تو رستمی فحاش[2]۔

یونہی دہلی کی "سوداگر بچی" کا چہرہ بھی معصومیت و عاطفت[3] کی تھوڑی سی بُو لئے ہوئے تھا اور میرا سین کا بہت زیادہ۔ مگر عقمہ کے چہرہ میں فواحش کی بھنک بھی تھی۔

عقمہ اور رستمی میں کچھ پکا پن سا بھی تھا۔ جو حسن کا قاتل ہے جبکہ میرا میں فجاجت[4] تھی، جو حُسن ہے۔ اگر کسی کو سادہ لوحی میں بھی سادہ پرکاری دیکھنا ہو، تو وہ دخترِ بنگالہ میں ہی تھی۔

اگر میرا سین کا مت ہندو تھا۔ تو وہ کسی مندر کی دیو داسی تھی، اِس کا مذہب نصرانیت تھا، تو کلیسہ کی نن، اگر اُسکا دین اِسلام تھا، تو وہ متعفّف و متورّع رابعہ بصری تھی۔

عقمہ، کرن بالا، اور رُستمی اگر گوہر تھے، تو میرسین گوہرِ یک دانہ[5] و دُرِّ شہوار تھی۔ ان تینوں میں سے کسی سے بھی میرا سین کا نمبر نہیں چھینا جا سکتا تھا۔ گو وہ لوبائدارا[6] نہیں تھی۔ لیکن میراجی کے لئے لوبائدارا اسے بھی سوا تھی۔ تاریخِ ادبِ عالم میں متعدد شخصیتوں کے اذکار موجود ہیں۔ یونانِ قدیم کی شاعرہ، سیفو کو کسی نوجوان سے عشق تھا، اطالوی شاعر ڈانٹے نے

ـہ گہگیر: شریر گھوڑا۔ ـہ سلیطہ: جھگڑالو عورت۔

[1] فخارہ: ناز کرنے والے [2] فحاش: بد و بدزبان۔

[3] عاطفت: گرم گستری [4] فجاجت: کچا پن۔

[5] گوہرِ یک دانہ: نہایت قیمتی موتی۔

[6] لوبائدارا: وہ عورت جس میں اگنیہ دیوتا نے تمام جانوروں کے حسن کی چیزیں ایک جگہ جمع کر دی ہوں۔ مثلاً: ہرن کی آنکھ، چیتے کی کمر، کوئل کی آواز۔

بیٹرس سے، انگریزی شاعر کیٹس نے فینی براؤن سے، اور اردو کے سالقہ[1] سالار، غالب نے بھی ایک ڈومنی سے عشق کیا تھا۔ لیکن غالب نے اُس کے نام کی ہوا تک نہ دی تھی۔

میراجی اس میں منفرد ہے کہ اس نے اپنا نام چھوڑ کر محبوبہ کا نام اسطرح سے اختیار کیا تھا کہ اسکے اصل نام کو شاذونادر ہی جانتے ہیں۔ یہ سعادت تو قیس و فرہاد اور رانجھے تک کو نصیب نہیں ہوئی تھی۔ میراجی تو اس قابل تھا کہ اُسکا مرقع عشاق کی چترسالہ[2] میں صدر جگہ سجایا جاتا۔ نیز اسکے پورے اور نصف تنے مجسمے صرف پچیترالیہ[3] میں ہی نہ رکھے جاتے بلکہ شہر ہائے عاشقاں کے چوراہوں پر استھاپن[4] کئے جاتے۔ کیونکہ محبت کے جس مقام اعلیٰ پر میراجی پہنچا ہوا تھا، ہم اس مقام پر نہ بیٹرس والے ڈانٹے کو پاتے ہیں، نہ فینی براؤن والے کو اور نہ ہی میری گڈون والے شیلے کو۔

میراجی ایسا ابھاگا[5] شاعر تھا کہ اس کے کانوں میں فانی کی طرح ہمیشہ "نغمۂ غم" ہی کی آوازیں آتی رہیں۔ اُسے ایسی ہشاشت[6] تامہ یا فوز[7] کبھی نصیب نہیں ہوا۔ نہ ضرب الفتح[8] کی نوبت آئی۔ نہ اُس نے کبھی سُرنائے[9]

---

[1] سالقہ سالار: سردار۔
[2] چترسالہ: پکچر گیلری۔
[3] پچیترالیہ: عجائب گھر۔
[4] استھاپن: قائم۔
[5] ابھاگا: بدنصیب۔
[6] ہشاشت: خوشی۔
[7] فوز: کامیابی۔
[8] ضرب الفتح: فتح کا نقارہ۔
[9] سرنائے: شہنائی۔

سُنا اُسنے تمام عمر قنوطیں ہی بسر کی؛ اور دَلِدّرتا نے اُسکا کبھی پیچھا نہ چھوڑا۔

(۴۷)

گو میراجی بادہ خور بھی تھا، چرسی، بھنگڑ اور شاید باز بھی، مگر ایک واقعہ ایسا ہے کہ اُسکی کھوٹائی کو کھرے پن میں بدل سکتا ہے۔ میراجی کا ایک جانکار، یوسف ظفر ۱۹۶۸ء میں حجّ بیت اللہ کے بعد مدینۃ الرسول پہنچا تو وہ روضۂ اطہر کی جالیوں کے پاس اُن کے لئے دعائیں مانگنے لگا۔ جنہوں نے ایسا کرنے کی استدعا کی تھی۔ اِسی درمیان اُسے میراجی کا ہیولا سُجھائی دیا۔ اُسے بڑی حیرت ہوئی۔ کہ میراجی اور یہاں کہاں۔ اُس نے تو محمد ثناء اللہ جیسا اسلامی نام چھوڑ کر میراجی کا ہندوانہ نام اختیار کر لیا تھا۔ پھر یوسف ظفر کو یاد آیا کہ جب اُس نے میراجی سے دریافت کیا کہ محمد ثناء اللہ تو منشی مہتاب الدین کا رکھا ہوا بہت اچھا نام تھا، اِسے کیوں ترک کر دیا۔ تو مخاطب کا بادیدۂ تر جواب تھا کہ یہ گنہگار خود کو اِس نام کے قابل نہیں سمجھتا کہ رسولِ اکرمؐ کی نہایت برگزیدہ ہستی سے کم از کم نام میں تعلق رکھے۔ اِس پر یوسف ظفر نے میراجی کے لئے بھی دُعا مانگی تھی۔ اِس سے معلوم ہوا کہ میراجی کو سرورِ کائناتؐ کا کتنا احترام تھا، اور یہ ایسا ہے کہ گو میراجی میں قدس وہ بزرگ نہ سہی، مگر کیا خبر خدائے بخشندہ اُسے اِس ادب و احترام کی خاطر بخش دے۔

علاوہ ازیں یوسف ظفر نے میراجی کی ایک نظم "خدا" بھی پڑھی

۱؎ دَلِدّرتا: مفلسی۔

ہوئی تھی جسے رسالہ ہمایوں نے طبع کیا تھا۔ یہی نظم "سنئے ادارہ" نے ۱۹۴۷ء کی بہترین نظموں میں شامل کی تھی۔ میراجی نے یہاں رب ذوالجلال کو "روحِ ابد" قرار دیا ہے۔ یہ نظم فنی اعتبار سے کتنی ہی بلند پایہ ہو، لیکن "روحِ ابد" کو ایک گستاخانہ تشبیہ کہا جا سکتا ہے۔ مگر یوسف ظفر نے سوچا تھا کہ مشہور کہاوت ہے چاہنے والا چہیتے کے چاہنے والے کو بھی چاہتا ہے۔ چونکہ میراجی محبوب خدا کا چاہنے والا تھا۔ اس لئے وہ خدا کا بھی چہیتا بن گیا ہوگا۔

پاکستان بنا تو دلِ باختہ و دل تفتہ میراجی بمبئی میں تھا۔ اور اس کی بڑی تمنا تھی کہ وہ اس نئی مملکت میں آئے جہاں اُسکے خیال میں اب تک بنگالی بلڈنگ والی رہتی تھی۔ وہ اُسے نہ دیکھ سکے، تو اُسکی رنگا رنگ ساڑھیوں کو تو سُوکھتے ہوئے دیکھ کر اپنے دلدار کے ہندووانہ خوشبوؤں والے پنڈے کی تھفتگیوں کی بابت تو سوچ سکے گا۔ مگر وہ لاہور نہ آسکا۔ میراجی کے ایک واقف نے اُس بنگالن کو لاہور ریلوے اسٹیشن پر کہیں سے آتے ہوئے دیکھا۔ میراسین کی یہ کیفیت تھی کہ ؎

اک ادائے مستانہ سر سے پاؤں تک چھائی ہوئی

اُف تیری کافر جوانی جوش پر آئی ہوئی

میراسین نے اپنے کجرے نینوں کو رنگین چشمہ میں چھپایا ہوا تھا۔ اور گوری گوری باہوں میں رنگیلی چوڑیاں پہنی ہوئی تھیں۔ اسٹیشن پر تمام ہی اس سحرِ بنگالہ کو دیکھ رہے تھے۔

جس طرح سے ڈانٹے کو بیٹرس کی کبھی راہِ سلامی نصیب نہ ہوئی تھی۔ اسی طرح سے میراجی کو بھی میراسین کی راہ سلامی کبھی نصیب نہ ہوئی تھی۔

باب ۹

حاصلِ کلام و لفظِ آخر

(۴۸)

لاہور میں میراجی کی کافی قدر تھی۔ اُس نے اپنا ادبی سفر مولینا صلاح الدین کے رسالے "ادبی دنیا" سے شروع کیا تھا۔ جب اُسے آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ایک آسامی مل گئی، تو اُس نے ایک مجلسِ "خرابات" قائم کی تھی، جس میں فیض، سالک، دینا ناتھ اور قیوم نظر جیسے ادیب شریک ہوتے تھے۔ حلقۂ اربابِ ذوق کا وہ موسس نہ سہی، لیکن یہاں اُسکی حیثیت میرِ مجلس سے کم نہ ہوتی تھی۔ جب وہ کسی فن پارہ پر تنقید کرتا، تو اپنے لئے ہمیشہ لفظ "ہم" استعمال کیا کرتا تھا۔ لاہو میں اُس کے تعلقات صنفِ نازک سے نہ تھے۔ اگرچہ وہ بازارِ حُسن میں جایا کرتا تھا۔

جب وہ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے منسلک ہوا، تو لوجلہ پہاڑی کی، پچیس سالہ چشم ہائے بیمار، لانبی گردن، اور ساڑھے پانچ فٹ قد والی کنواری صفیہ عتیقی سے دلچسپی رکھنے لگا تھا۔ جب یہ شلوار پہنے ہوئے اپنی لمبی مُوباف لگی چوٹی پیٹھ پر ڈالے ہوئے پہنچتی، تو میراجی اُسے دیکھا کرتا تھا۔ اُسکی تعلیم صرف مڈل تک تھی، مگر اُسکا اُردو لہجہ اتنا جاذب ذہن تھا کہ اُسے اکثر اُردو ڈراموں میں کام کرنے کے لئے رکھا کرتے تھے۔ اُس

کی آنکھوں کو دیکھ کر سودا کا یہ مصرعہ یاد آیا کرتا تھا۔

؎ دیکھ بیماری من آنکھوں کی ہیں بیمار ہُوا

اِسی طرح سے میراجی آغا شاعر کی کھلتی ہوئی سانولی رنگت والی اٹھارہ سالہ منھ بولی اور بُلبُل ہزار داستان اناو نسر، سحاب قزلباش پر بھی نظریں جمانے کوشش کیا کرتا تھا۔

تیسری لڑکی مسز حامد حسین کا چہرہ گلی قاسم جان کی دوغلی سوداگر بچی، عقمہ، جیسا چمکتا ہوا گورا تھا۔ عقمہ واقعی اپنے ہندو باپ اور مسلمان ماں، دونوں کی صفتیں موجود تھیں۔

مسز حامد حسین جب نئی دہلی کے کناٹ پیلیس سے ساڑھی میں ملبوس ریڈیو اسٹیشن پہنچتی تو اُسے سب ہی کم از کم کنکھیوں سے دیکھا کرتے تھے۔ اور پھر بال ودھوا کرن مالا یاد دبھی تھی۔ میراجی اِن لڑکیوں میں سے کسی کو بھی اپنی خداوندی میں نہیں لاسکا تھا۔ البتہ گلی قاسم جان کی سوداگر بچّی، عقمہ سے اس نے اتنی رسائی حاصل کرلی تھی کہ وہ اُسے کچھ دیر کو اپنی فوقانی و تحتانی بنا سکا تھا۔" اور یہ لڑکی بھی اسے اپنا فوقانی و تحتانی بنا چکی تھی۔ میراجی نے عقمہ کے سینہ، پیٹ، پیڑو، سانتھلوں کی خوب سیر کی تھی، مگر بس۔

۴۹

بمبئی پہنچ کر میراجی کا دِل ایک مالا بار کے کرمند[1] جنگلی گدمر بیٹے کی جنانی سے ہوئی اور پارسی ماں کی جنی ہوئی، ترجیح دیتا تھا۔ دھابوں

---

[1] کرمند: طاقتور۔

میں ناچنے والی، اُجڈ، کرخت، درندہ خو، مُستبھل[1] و طاغی[2]، طالح[3] اور وشیر[4] جیسی رستمی پر آگیا تھا، جس نے اُسکی بال دھوا کرن مالا یادو کی طرح سے بے آبروئی کی تھی۔ گو وہ دُرمکھ[5] سی تھی، مگر اُسکی دُرمکھی میں بھی حُسن تھا۔ وہ دو لتّیاں جھاڑنی سی لگتی تھی، لیکن اگر وہ دلتیاں چھانٹتی ہوئی بھی ہوتی تو اِس کے اِس پشتک چھانٹنے میں بھی لطف تھا۔

بمبئی میں میراجی عصمت چغتائی سے بھی ملا تھا۔ اور اگرچہ اُسے پرسی بائشی شیلے کی طرح تشرّع کا قائل نہ ہونے کے سبب، شادی سے چڑ تھی۔ وہ ناجائز تعلّقات پیدا کرنے کو فوقیت دیتا تھا۔ لیکن اُس سے پہلی بدپرہیزی عقمہ سے شادی کرنے کی نیت سے ہوئی تھی۔ اور دوسری بدپرہیزی "پری وِش؟" عصمت چغتائی کے ساتھ شادی کرنے کے خیال سے ہوئی تھی، مگر یہ چرس بھری سگرٹیں پینے والا بھنگڑ اور شرابی، اُس پر ذرا کو ہاتھ بھی نہ رکھ سکا تھا، چہ جائے کہ اُلجھ کر اُسکا مُنبت کار[6] بنے۔

میراجی ہر مودک[7] کنیا کو اِس طرح سے دیکھا کرتا تھا۔ جیسے کوئی امریاں کے پیڑوں پر لگے ہوئے اُن آموں کو دیکھا کرتا ہے جنہیں مینہ کے پانیوں نے ٹھنڈا کیا ہوا ہو، اور اُنکا ٹپکا پڑنے کو تیار بمبئی کی کوئی بھی قبول صورت چیرا بند لڑکی پاس سے گزرتی تو اُسکی چوحدی ناپنے کے لئے مضطرب ہو جایا کرتا تھا اور اپنی انا اُس کے بھیتر اُن کے اندر اسطرح سے جڑ

---

[1] مستبھل: شریر۔
[2] طاغی: سرکش
[3] طالح: ناہنجار
[4] وشیر: ایک بکبکا پھل۔ (A pungent fruit)
[5] دُرمکھ: بدصورت۔
[6] مُنبت کار: وہ کاریگر جو زیور میں جواہرات جڑتا ہے۔
[7] مودک: دل خوش کُن۔

پینے کو تیار جسطرح سے زرگر زیور میں جواہر جڑتا ہے۔ وہ دو چلّو میں بہک جایا کرتا تھا۔ اُس میں جاننے والی سے فوراً آمیز ہونے کی بے حد للک پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ اور وہ خود کو بڑی مشکل سے روکا کرتا تھا۔

ایک مرتبہ میراجی کو تپ لرزہ کی شکایت پیدا ہوئی اور ایک کاٹھیا واڑی ڈاکٹر نے اُسکے ساتھل پر ٹیکا لگانے کی کوشش کی تو وہ نہ مانا۔ اور کونین کا مکسچر پینے کو ترجیح دی۔ اس سے پہلے وہ اپنی دونوں کلائیوں پر میراسین کا نام گُدوانا چاہتا تھا۔ اُس کے ایک دوست نے کہا کہ گُدوانے میں بھی تو سُوئیاں چبھوئی جاتی ہیں۔ اور تکلیف ہوتی ہے۔ میراجی نے جواب دیا تھا کہ میراسین تو مجھے بھوکے چیتے کو بھی کھلانا چاہے، تو میں دریغ نہ کروں۔ اِس بیماری میں وہ بہت چڑچڑ گیا تھا اور اُسکے منہ سے کراہتے ہوئے بار بار "میرا میرا" کے بول نکل رہے تھے۔

میراجی ہندو مت کی طرف تو مائل تھا ہی، اُسے دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر لیجاتے ہوئے پرنام کا دستور بہت پسند تھا۔ اُس کی تمنا تھی، کہ وہ میراسین پہ دادری حاصل نہ کر سکتا، مگر اگر وہ ایک مرتبہ بھی اس ادا سے پرنام کر دیتی، تو وہ اس ریت پر کُل کائنات از سمک تا سماک نچھاور کر دیتا۔ اگر وہ اسے اپنا حضوری بنالیتی، تو یہ اُسکی بسر و چشم خدمت کرتا۔ اگر وہ اِسے بجائے اپنے لات و منات کو سجدہ کرنے کو کہتی تو یہ اِن بتوں کو بھی سجدہ کر لیتا۔

ایک مرتبہ شام گاہ میراجی اور لاہوری لڑکا مشیر چوپاٹی کی تفریح گاہ سے گزرتے ہوئے ہینگنگ گارڈن کی پہاڑیوں کو جا رہے تھے کہ انہیں ایک من بھاؤنی لڑکی ملی۔ اُسکے ماتھے کی بندی سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی کی بیاہتا ہے۔ مگر وہ نو رسیدہ تھی۔ کیونکہ اُس کے ٹھمکتے چھوٹے چھوٹے تھے۔ میراجی اس لڑکی کو ناشکیبائی اور اضطرابی طور سے دیکھنے لگا، لڑکی اِس بے تحملی سے گھبرا سی گئی۔ میراجی کھیپ ہارا[1]، کرم ہیٹا، قسمت پھوٹا نظر

---

[1] کھیپ ہارا: گھاٹے میں آیا ہوا۔

یادشاہ نہیں۔ جھولی والا نہ سہی، پر یہ سچ مچ بھیک منگا ہے۔ ایسا کہ جیسے دسوکھا[1] جھاڑتا ہوا کوکرہ[2]۔

پہلی لڑکی: جن آنکھوں سے یہ ہمیں گھور رہا ہے، انہیں تو آگ میں لال کئے ہوئے سوئیں سے بیدہ بیدہ کر پھوڑ دینا چاہیئے۔

میراجی ان لڑکیوں کے دُدلانے[3] اور املتا[4] پر بھی حسبِ سابق چپ رہا تو دنیا نے اس ارفع و بلند پایہ ادیب کی یہ قدردانی کی تھی۔ بمبئی کے ایسے مشاہیر میں جیسے سردار جعفری، جوش ملیح آبادی، ساحر لدھیانوی اور دِنسو امستر عادل تھے، اُسے افتخار کی جگہ ملتی تھی۔ وہ بقول رستی امکا ڈمکا نہیں تھا۔ وہ تو ادبی محفلوں میں ایسا لگا کرتا تھا جیسے برطانوی تاج میں کوہِ نور۔ اُس کی غنیمت اور فصاحت و بلاغت مانی ہوئی تھی۔ وہ اتنا ذلیق[5] تھا کہ جب وہ بولتا تو اجنبی یہ سمجھتے کہ اگر اس کی بود و باش قلعۂ معلّیٰ میں نہ تھی تو یہ ضرور لکھنوئی تھا۔ وہ فلسفی بھی تھا۔ اور ہندو دیو مالا میں طاق۔ اُسے سماع سے بھی بہت دلچسپی تھی۔ اور طبلہ بجا سکتا تھا۔ مشاعروں میں اُسکی دھیمی دھیمی آواز اور مدھر ہندی الفاظ کا میل، مشاعروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔

۵۰

مگر اتنا ذی وقعت ہونے کے باوجود میراجی مسکنت[6] زدہ تھا۔ اُسنے

بقیہ حاشیہ صفحہ — : ٹمکتا: سرپستان

[1] دسوکھا جھاڑتا ہوا: گریزی آیا ہوا۔

[2] کوکرہ: مرغا۔

[3] دُدلاتا: بُرا بھلا کہنا

[4] املتا: تلخی

[5] ذلیق: خوش گفتار۔

[6] مسکنت: غربت

فلم انڈسٹری کے بہتیرے چکر لگائے۔ پر وہاں اسکی کوئی پرسش نہ ہوئی۔ اُس نے اختر الایمان کے ساتھ رسالہ "خیال" نکالا، مگر اُسکی جیبیں پھر بھی خالی ہی رہیں۔ وہ "پیارے لوگوں" کو پکارتا رہا کہ "قریب آؤ"۔ پیارے لوگ اُس کے قریب تو آتے تھے لیکن اِسے اُس لڑکی کی طرح سے کسی نے سِکہ پیش نہ کیا جس طرح سے اُس لڑکی نے تفریح گاہ چوپاٹی میں اُسے گدا سمجھ کر پیش کیا تھا۔ حالانکہ حزینی و درماندگی اُس کے چہرہ سے پھوٹی پڑا کرتی تھی۔

اسکے پاس رستارنتوں میں کھانے کے لئے دام نہ ہوتے تھے۔ وہ دوستوں کے یہاں اپنا پیٹ بھرلیتا تھا۔ اور جہاں رات ہو جاتی وہیں پڑ رہتا اس کے دوست ہی کبھی کبھی اُسے سبز نار یل کا ٹھنڈا دودھ پلا دیا کرتے تھے۔

منشی مہتاب الدین کے غریبُ الدّیار اور بے بضاعت لڑکے کی، جس نے باپ کا رکھا ہوا نام "محمد ثناءاللہ ڈار"، قضا کر کے ایک نِٹھُر بُزدلے اور بے درد بنگالن، میرا سین کے نام پر میراجی رکھا تھا۔ بمبئی آکر زمانہ کے ہاتھوں زیادہ ہی دُرگت بن گئی تھی۔ وہ بمبئی آکر میرین ڈرائیو، ہینگنگ گارڈن کی پہاڑیوں، چوپاٹی، جم خانہ کے سبزہ زاروں، اور بحیرۂ عرب کے ساحلوں پر ہوا پھانکتا ہوا پھرا کرتا تھا۔

شیکسپیئر نے اپنے ڈرامے (As you like it) ایز یو لائک اِٹ میں دنیا کے دکھوں کی بابت امیرزادی روزالنڈ کے منہ سے یہ الفاظ ادا کرائے ہیں ؎

(Oh! How full of   is this world.)

او یہ دنیا کتنی کانٹوں بھری ہے۔

تو یہی حال اردو کے اس (Genius) جینیس، طباع ذکی و متمایز ہستی کا بھی ہوا تھا جس نے اردو شاعری میں اپنی ہنرمندی سے نئی بنیادیں ڈالی تھیں۔ اُسکے ہمعصر اُس کی استعداد و اعتلا دیکھ کر عرقِ استعجاب ہو جایا کرتے تھے۔ اور بزم ہائے سخن میں اس ریزہ کار کی عنایات و برکات قابلِ

داؤ ہوا کرتی تھیں۔ وہ نہ دغولیا تھا، نہ متنازع، نہ بد باطن، لیکن یہ بات بس بوہ درست ہے کہ وہ فرزندا نہ ہرگز نہ تھا۔ البتہ بہت حد تک افقر[1] تھا۔ افسوس حسینوں سے وہ ایک بُرکی[2] بھی نہ اٹھا سکا، چہ جائیکہ اُن پر گاچھی[3] ڈال سکتا۔ اُسکے لہنے[4] میں اُن سے برومندی کی جگہ دُلتیاں کھانا لکھی تھیں۔ وہ دائماً بکائن کی کڑوی نبولیاں ہی چباتا رہا تھا۔ اس نے آنندتا کے کھیت سے کھونڈر[5] بٹورنے کے لئے ہاتھ بڑھائے تھے۔ لیکن اُسے وہاں پڑا ہوا اناج کا ایک دانہ تک میسر نہیں آیا تھا۔

اقبال کو تو "سمندر کی آبرو" جزیرۂ سسلی کا ماتم بخشا گیا تھا، اور مجھ نااہل مصنف کو اُردو کی "آبرو" محمد ثناءاللہ ڈار عرف میراجی، کا ماتم بخشا گیا ہے۔

میر کا یہ شعر اِس مجذوب سے اور مُحبّتی مگر مفلوک[6] و مفلوج[7] اور بورا ہے انسان پر واقعی صادق آتا ہے۔

پیدا کہاں ہوں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

---

[1] افقر: نہایت غریب۔
[2] بُرکی: چھوٹا لقمہ۔
[3] گاچھی: اِسے لدو مویشی کی کمر پر ڈال کر بوجھ لادتے ہیں۔
[4] لہنا: قسمت۔
[5] کھونڈر: کھیت کٹنے کے بعد پڑا ہوا بچا کھچا غلّہ۔
[6] مفلوک: مفلسی۔
[7] مفلوج: فالج زدہ۔

تمت